تعلیم و تربیت
جنوری
1998ء
نیا سال مبارک

شیطان نے روزہ رکھا

سید نظر زیدی

"باجی باجی، آپ کو معلوم ہے آج کیا ہوا؟" فرقان نے باجی کے قریب آکر یوں کہا جیسے کوئی بہت ہی خاص خبر سنانے والا ہو۔

باجی سلیمہ میز پر جھکی کالج کا کام کر رہی تھیں۔ فرقان کی آواز سن کر مسکراتی نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں۔ "ہاں، معلوم ہے۔ سناؤ کون سی انٹ شنٹ خبر لے کر آئے ہو!"

"نہیں باجی جان، انٹ شنٹ نہیں بالکل سچی خبر ہے۔ میرا دوست غفور کہ رہا تھا، ہندوستان کے وزیراعظم نے یہ بات مان لی ہے کہ کشمیر واقعی پاکستان کا حصہ ہے اور بنگلہ دیش کی وزیراعظم محترمہ شیخ حسینہ واجد نے بھی اعلان کر دیا ہے کہ بنگلہ دیش اب الگ ملک نہیں بلکہ اس کا نام مشرقی پاکستان ہے" فرقان نے باجی کے قریب کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"فرقان بھیا، آج ماننا پڑ گیا کہ تم آدمی بہت خوب ہو، تمہارے دوست یونہی تمہیں شیطان نہیں کہتے۔ ویسے پاکستان کی گولڈن جوبلی کے حوالے سے تم نے بہترین خبر سنائی ہے۔ جی خوش ہو گیا، لیکن اس کے سچ ہونے میں اچھا خاصا شک ہے۔ ابھی دنیا اتنی شریف نہیں ہوئی کہ لوگ ایسے اچھے اچھے کام کرنے لگیں اور وہ بھی بھارت اور بنگلہ دیش کے وزرائے اعظم۔ پیارے بھائی، یہ بتاؤ تمہیں ایسی باتیں سوجھتی کیوں ہیں۔ کیا تمہیں یہ معلوم نہیں کہ جھوٹ بولنا سخت گناہ ہے۔ خاص طور سے اس رمضان کے مہینے میں تو یہ گناہ اور بھی گھناؤنا بن جاتا ہے" باجی نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

"واہ باجی، بھلا اس میں جھوٹ بولنے کی کیا بات ہے۔ میں نے جو خبر اپنے دوست سے سنی تھی آپ کو سنا دی" فرقان نے یوں کہا جیسے واقعی سچ بول رہا ہو۔

اس ڈھیٹ پن پر باجی سنجیدہ ہو گئیں۔ افسوس بھری آواز میں بولیں۔ "یاد آتا ہے ہم نے تمہیں بہت دفعہ سمجھایا ہے کہ مذاق، مذاق میں جھوٹ بولنا بھی بہت بڑا گناہ ہے۔ بزرگوں نے اسے سب گناہوں کی جڑ بتایا ہے۔ اگر کوئی صرف جھوٹ بولنا چھوڑ دے تو بہت سے گناہوں سے بچ جاتا ہے۔ لیکن تم یہ گناہ نہیں چھوڑتے"۔

"کیا واقعی باجی؟ میں تو بس ہنسنے ہنسانے اور خوش ہونے کے لیے ایسی باتیں کیا کرتا ہوں۔ اگر یہ واقعی ایسا گناہ ہے تو میں وعدہ کرتا ہوں آئندہ جھوٹ نہ بولوں گا" فرقان نے یقین دلانے کے انداز میں کہا۔

باجی خوش ہو کر بولیں "اگر تم نے جھوٹ نہ بولنے کا پکا ارادہ کیا ہے تو انشاء اللہ بہت برکتیں ملیں گی تمہیں۔ اچھا اب یہ بتاؤ روزہ ہے تمہارا؟ سحری تو تم نے سب کے ساتھ کھائی تھی"۔

"آپ کو یہ شک کیوں ہوا کہ میرا روزہ نہ ہو گا، آخر میں نے روزہ رکھنے کے لیے ہی سحری کھائی تھی"۔

"ہمیں یہ شک اس لیے ہوا کہ تمہارا چہرہ روزہ داروں جیسا نہیں لگ رہا۔ ماشاء اللہ یوں تروتازہ ہے جیسے

اسکول میں چاٹ اڑاتے رہے ہو۔ لو اب سچ سچ بتا دو ہمارا خیال ٹھیک ہے یا غلط۔ تمہارے جواب سے یہ اندازہ بھی ہو جائے گا کہ تم نے جھوٹ نہ بولنے کا پکا وعدہ کیا ہے یا ایک اور تازہ جھوٹ بولا ہے"۔

فرقان ہنستے ہنستے بولا "باجی جان' سچی بات تو یہ ہے کہ میرا آج کا روزہ بھی ویسا ہی ہے جیسا رکھا کرتا ہوں"۔

"صرف دکھاوے کا' یعنی تم اسکول میں واقعی کھاتے پیتے رہے ہو؟" باجی نے بہت حیران ہو کر فرقان کی طرف دیکھا جو سر جھکائے مسکرا رہا تھا۔ وہ کچھ دیر رک کر بولا "ہاں باجی' سچی بات تو یہی ہے۔ وہ دراصل میں نے بہت دن پہلے ایک لطیفہ سنا تھا۔ ایک صاحب اپنے گھر والوں کے ساتھ پیٹ بھر کر سحری کھاتے اور افطار کے وقت بھی خوب بڑھ بڑھ کر ہاتھ مارتے تھے' لیکن روزہ نہ رکھتے تھے۔ ان کے ایک دوست نے ان سے کہا "یار تم سحری بھی کھاتے ہو' افطاری میں بھی حصہ بٹاتے ہو' لیکن روزہ نہیں رکھتے"۔ اپنے دوست کی یہ بات سن کر وہ صاحب جلدی سے بولے "تو کیا میں بالکل ہی کافر ہو جاؤں کہ روزہ نہ رکھنے کے ساتھ سحری اور افطاری میں بھی حصہ نہ لوں' ہو میری پیاری باجی جان میں بالکل ہی کافر ہو جانے کے ڈر سے سحری اور افطاری میں حصہ لیتا ہوں"۔

روزہ نہ رکھنے اور دن میں کھاتے پیتے رہنے کی بات سن کر باجی کو غصہ آگیا تھا' لیکن لطیفہ سن کر ہنس پڑیں اور فرقان کو جو ان کا لاڈلا چھوٹا بھائی تھا پیار کرتے ہوئے بولیں "شیطان کہیں کے' تم نے لطیفے کو تو ٹھیک سمجھ لیا' ہم سب کی طرف نہ دیکھا جو تمام شرطوں کے ساتھ روزہ رکھتے ہیں!"

"فائدہ تو اسی میں تھا نا باجی۔ ویسے کیا روزہ رکھنے کی کچھ شرطیں بھی ہیں؟" فرقان نے بھولا سا منہ بنا کر سوال کیا۔

"بالکل شرطیں ہیں۔ یہ فرض عبادت ہے' یعنی ایسی عبادت کہ اگر کوئی نہ کرے تو اسے سخت عذاب ہو گا اور جس طرح نماز پڑھنے کے لیے ضروری ہے کہ لباس اور بدن پاک ہو۔ وہ جگہ پاک ہو جہاں نماز پڑھنی ہے۔ نماز شروع کرنے سے پہلے وضو کیا جائے۔ رخ کعبہ شریف کی طرف ہو اور نیت باندھی جائے۔ اسی طرح روزہ رکھنے کے لیے ضروری باتیں یہ ہیں۔

(۱) سحری کھائی جائے۔ (۲) روزے کی نیت کی جائے۔ (۳) لڑائی جھگڑے سے بچا جائے۔ (۴) چغلی اور غیبت سے بچا جائے۔ (۵) صبح صادق سے سورج ڈوبنے تک نہ کچھ کھائیں اور نہ کچھ پئیں۔ (۶) پابندی سے نماز پڑھی جائے اور فرض نمازوں کے ساتھ تراویح ادا کی جائیں۔

جو لوگ ان سب باتوں کا خیال رکھے بغیر روزہ رکھتے ہیں ان کا روزہ نہیں ہوتا۔ بس فاقہ ہوتا ہے۔ جس کا انہیں کچھ ثواب نہیں ملتا"۔

"باجی جان' یہ تو زبردست نسخہ ہے روزے کا' اب یہ بات اور بتا دیجئے کہ ان شرطوں کے ساتھ روزہ رکھنے کا فائدہ کیا ہے؟"

"پیارے بھائی' اللہ کی عبادت سوداگری نہیں ہے کہ اس میں نفع تلاش کیا جائے۔ یہ تو اپنے اس اللہ کا حکم ماننا ہے جس نے ہزاروں نعمتیں ہمیں دی ہیں۔ پھر بھی ہم پر اللہ کا یہ خاص احسان ہے کہ اس نے اپنی عبادتوں میں ہمارے دنیاوی فائدے بھی رکھے ہیں۔ نماز' روزہ' حج' زکات اور جہاد ہمارے دین کی فرض عبادتیں ہیں اور ان میں اللہ کی خوشنودی حاصل ہونے کے علاوہ دنیا کے فائدے بھی ہیں۔ مثال کے طور پر یہ فائدہ کہ اللہ کی عبادت کرنے والا آدمی غلط کاموں اور برے خیالات سے بچا رہتا ہے۔ جیسا کہ میں نے ابھی روزے کے بارے میں بتایا کہ اگر کوئی شخص برائیوں سے نہ بچے تو اس کا روزہ نہ ہو گا صرف فاقہ ہو گا"۔

"واہ باجی واہ' آپ نے تو مجھے ایسی باتیں بتائیں جو اب تک کسی نے نہ بتائی تھیں۔ اللہ چاہے گا تو کل سے میں ایسے ہی روزے رکھوں گا۔ نہ شرارت نہ جھوٹ اور نہ

کوئی اور غلط کام"

"اللہ کرے ایسا ہی ہو' بس یہ ارادہ اور کر لو کہ نماز بھی پڑھو گے" باجی نے خوش ہو کر کہا۔

"جی وہ تو میں پڑھوں گا ہی۔ جب یہ معلوم ہو گیا کہ نماز اور روزے کا ساتھ ہے' یعنی جو روزہ رکھے وہ نماز بھی ضرور پڑھے تو میں نماز کیوں نہ پڑھوں گا۔ بلکہ میری کوشش تو یہ ہو گی کہ تراویح بھی پڑھوں"۔

"ماشاء اللہ' ماشاء اللہ میں دعا کرتی ہوں اللہ پاک تمہیں اس ارادے پر قائم رہنے کی توفیق دے۔ لو اب اپنی زبان سے یہ اقرار اور کر لو کہ وہ خبر نری گپ تھی جو ذرا دیر پہلے تم نے خاص طور پر مجھے سنائی تھی۔ یہ بات میں اس لیے کہہ رہی ہوں کہ اگر یہ مان لیا جائے کہ یہ گناہ کیا تھا تو اللہ معاف کر دیتا ہے"۔

"وہ تو بالکل گپ تھی' اگر آپ ٹوک نہ دیتیں تو ایسی کئی خبریں میں آپ کو سنانے والا تھا" فرقان نے کہا۔

باجی مسکراتے ہوئے بولیں "خدا کا شکر ہے تم گناہ سے بچ گئے۔ لو اب تشریف لے جاؤ یہاں سے۔ مجھے اپنا کام ختم کرنا ہے"۔

"بالکل باجی جان بالکل' لیجیے میں چلا۔ ان شاء اللہ افطار کے وقت حاضر ہوں گا' لیکن دیکھیے یہ ظاہر نہ کیجیے گا کہ میں بالکل کافر ہو جانے کے خطرے سے بچنے کے لیے افطاری چکھ رہا ہوں"۔

فرقان کی یہ بات سن کر باجی نے قہقہہ لگایا اور ہنستے ہنستے بولیں "آج تو میں اپنے بھائی کو اپنے پاس بٹھاؤں گی اور خوب اچھی اچھی چیزیں کھلاؤں گی"۔

"شکریہ باجی جان' شکریہ۔ لیجیے میں چلا" یہ کہہ کر فرقان جھومتا جھامتا اور ہنستا مسکراتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ باجی خوشی بھری نظروں سے اسے دیکھتی رہیں۔ اس وقت انہیں اپنا یہ شریر بھائی بہت ہی پیارا لگ رہا تھا۔

وعدے کے مطابق باجی نے افطار کے وقت فرقان کو اپنے پاس بٹھایا اور خوب اچھی اچھی چیزیں کھلائیں۔ بلکہ سحری کے وقت بھی انہوں نے اسے اپنے قریب ہی بٹھایا اور بہت اصرار کر کے اچھی اچھی چیزیں کھلائیں۔

اس سلوک سے وہ پھولے نہ سما رہا تھا۔ اسکول گیا تو ساتھیوں نے عادت کے مطابق ہنسی مذاق کی باتیں شروع کر دیں' اس کی عادت تھی ایسے موقعوں پر زبردست جوابی کارروائی کیا کرتا تھا لیکن آج چپ رہا۔

بلکہ یہ کہہ کر سبق دوہرانے لگا "بھئی فضول باتیں نہ کرو۔ ماسٹر صاحب آنے والے ہیں کام کرو اپنا اپنا"۔

جنید گپ شپ' جگت بازی اور لطیفے گھڑنے میں فرقان کا پکا ساتھی تھا۔ حیران ہو کر بولا "خیریت تو ہے شیطان بھائی؟ اماں جان نے جھاڑو سے جھاڑ پونچھ کر کے تو اسکول نہیں بھیجا برخوردار کو"؟

فرقان نے فضول باتوں سے بچنے کا پکا ارادہ نہ کر لیا ہوتا تو جنید کو خوب کرارا جواب دیتا۔ لیکن اب اس نے اس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ اپنے کام میں لگا رہا اور یوں اسے کچھ اور کہنے کی جرات نہ ہوئی۔

آدھی چھٹی میں فرقان کی شرارتیں کچھ اور نکھر جایا کرتی تھیں۔ وہ چاٹ بھی جی بھر کر اڑاتا تھا' لیکن آج یہ وقت بھی اس نے بہت شرافت سے گزارا۔ کسی لڑکے نے تنگ کیا تو جوابی کارروائی کرنے کے بجائے اس کے پاس سے ہٹ گیا۔ اس نے اپنا کام بھی بہت توجہ اور محنت سے کیا۔ اس کا یہ دن بہت ہی اچھا گزرا۔ نہ چھیڑ چھاڑ' نہ مار کٹائی۔ استادوں نے جو کچھ پڑھایا تھا اسے اس طرح یاد ہو گیا جیسے ذہن پر لکھ دیا گیا ہو۔

پوری چھٹی کے بعد جب وہ گھر آیا تو ایک اور ہی فرقان لگ رہا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اس نے اتنا وقت کچھ کھائے پیے بغیر گزارا تھا۔ وہ اچھی خاصی کمزوری محسوس کر رہا تھا' لیکن یہ کمزوری اسے اچھی لگ رہی تھی۔ محسوس کر رہا تھا کہ اس نے کوئی عمدہ بات کی ہے۔

گھر میں باجی جیسے اس کا انتظار کر رہی تھیں۔ جیسے ہی وہ اپنے کمرے میں پہنچا وہ اس کے پاس آگئیں اور اسے غور

سے دیکھتے ہوئے بولیں "ہمارا پیارا بھائی آگیا"۔

وہ دراصل یہ اندازہ کرنا چاہتی تھیں کہ وہ اپنے وعدے پر قائم رہا ہے یا نہیں۔ اس کے اترے ہوئے چہرے پر نظر پڑتے ہی انہیں یقین آگیا کہ اس نے اپنا وعدہ پورا کیا ہے۔ بہت خوش ہو کر اس کے پاس والی کرسی پر بیٹھ گئیں اور انگلیوں سے اس کے بال سلجھاتے ہوئے بولیں "کہئے شیطان صاحب، آج روزہ کیسا رہا؟"

فرقان شرمندہ سا ہو کر بولا "باجی آپ تو ہمیں شیطان نہ کہئے"۔

"اوہ، ہاں واقعی ہمیں اپنے بھیا کو شیطان نہیں کہنا چاہیے۔ بس یونہی منہ سے نکل گیا۔ ویسے واقعہ یہ ہے کہ آج کئی بار خیال آیا۔ شیطان کو روزہ رکھوایا ہے۔ خدا کرے اس کا روزہ روزہ رہے اور خوزا نہ بن جائے، لیکن اب شرمندگی ہو رہی ہے کہ ہم نے ناحق شک کیا"۔

"آپ کو یہ بات کیسے معلوم ہوئی کہ میں نے واقعی روزہ رکھا ہے؟" فرقان نے سنجیدہ آواز میں سوال کیا۔ باجی

کی یہ بات سن کر اسے یاد آگیا تھا کہ غیب کی باتیں اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

باجی اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولیں "تمہارے چہرے پر نیکی کا نور دیکھ کر۔ آج تمہارے چہرے پر پہلے جیسی شوخی نہیں ہے، یہ اس بات کی گواہی ہے کہ آج نہ تم نے کوئی غلط کام کیا ہے اور نہ کچھ کھایا پیا ہے۔ اچھا لو اب تم آرام کرو۔ اللہ نے چاہا تو افطار کے وقت ملاقات ہو گی۔ امی جان سے کہ کر آج ہم نے وہ ساری چیزیں پکوائی اور بازار سے منگوائی ہیں جو تمہیں پسند ہیں۔ ہمارے نزدیک آج تم نے پہلا روزہ رکھا ہے"۔

"ہاں باجی میں بھی یہی محسوس کر رہا ہوں، بلکہ مجھے تو یوں لگ رہا ہے کہ زندگی میں پہلا اچھا دن گزارا ہے۔ یہ سوچ کر بہت خوشی محسوس کر رہا ہوں کہ اللہ کے حکم کے مطابق وقت گزارا"۔

"خدا کا شکر ہے تمہیں ایسا لگا۔ یہ بات ان لوگوں کی سمجھ میں آتی ہے جو بہت ہی خوش نصیب ہوتے ہیں کہ سچی خوشی اچھلنے کودنے اور چھچھوری حرکتیں کرنے سے حاصل نہیں ہوتی۔ بلکہ نیکی کے کام کرنے سے حاصل ہوتی ہے"۔

"آپ بالکل ٹھیک کہ رہی ہیں۔ مجھے ایسا ہی لگ رہا ہے۔ شرارتیں کر کے خوش ہونا تو بالکل فضول بات ہے۔ بالکل ایسی بات جیسے کوئی آگ میں ٹھنڈک تلاش کرے"۔

"میں دعا کرتی ہوں یہ خیال تمہارے دل میں پوری طرح بیٹھ جائے اور تم خوشیوں سے بھری ہوئی زندگی گزارو"۔

"اچھا باجی جان مہربانی کر کے ایک بات مجھے اور بتا دیجئے۔ میں نے سنا ہے رمضان شریف میں شیطانوں کو قید کر دیا جاتا ہے۔ کیا یہ بات سچ ہے؟"

"بالکل سچ ہے بھئی۔ تم دیکھتے نہیں اس مبارک مہینے میں نیکیوں کے کتنے کام ہوتے ہیں۔ اللہ کی کتنی عبادت کی جاتی ہے۔ یہ سب باتیں اسی صورت میں تو ہوتی ہیں کہ شیطان قید ہو جاتے ہیں۔ ویسے اس سلسلے میں سمجھنے کے

قابل بات یہ ہے کہ شیاطین کو قید کر دینے کی بات ہمیں یہ سمجھانے کے لیے کی گئی ہے کہ اللہ کے نیک بندے اس مہینے میں زیادہ نیکیاں کرتے ہیں تو شیطانوں کا زور ٹوٹ جاتا ہے اور وہ گویا ایک طرح قید ہو جاتے ہیں۔ تم اپنی آج کی بات پر غور کرو۔ تم نے صحیح معنوں میں روزہ رکھا تو ان ساری غلط باتوں سے بچ گئے جو تمہارا شیطان تم سے کراتا تھا اور جن کی وجہ سے تمہارے ساتھی تمہیں شیطان کہتے تھے"۔

"باجی جان' کیا میرا بھی کوئی شیطان ہے؟" فرقان نے بہت حیران ہو کر سوال کیا۔

"بالکل ہے۔ وہی تو تم سے خراب خراب کام کرواتا رہتا ہے۔ کبھی جھوٹ بلواتا ہے۔ کبھی ایسی شرارت کرواتا ہے جس سے دوسروں کو رنج یا تکلیف پہنچتی ہے۔ بزرگوں کا کہنا ہے اللہ پاک ہر آدمی کی حفاظت کے لیے فرشتے مقرر کرتا ہے جو اسے پریشانیوں اور مصیبتوں سے بچاتے ہیں۔ وہ اس وقت تک ساتھ رہتے ہیں جب تک انسان نیکی کے راستے پر چلتا رہتا ہے۔ اگر وہ راستہ چھوڑ کر برائی کے راستے پر چلنے لگے تو حفاظت کرنے والے فرشتے اس کے پاس سے ہٹ جاتے ہیں اور پھر شیطان اسے گھیر لیتے ہیں اور اس سے برائی اور گناہ کے کام کرواتے ہیں"۔

"تو کیا آج سے پہلے مجھے شیطانوں یا شیطان نے گھیر رکھا تھا؟" فرقان نے ایک اور سوال کیا۔

باجی بولیں "بالکل ایسا ہی تھا۔ آج تم نے غلط کام نہ کرنے کا پکا ارادہ کیا تو وہ تمہارے پاس سے ہٹ گئے۔ گویا ایک طرح قید ہو گئے۔ اگر تمہارا یہ ارادہ پکا رہا کہ بھول کر بھی کوئی گناہ نہ کرو گے تو وہ تم سے ہمیشہ کے لیے دور ہو جائیں گے اور وہ فرشتے نزدیک آ جائیں گے جو اللہ نے تمہاری حفاظت کے لیے مقرر کیے ہیں اور تمہیں ایسی برکتیں حاصل ہونے لگیں گی جو اچھے لوگوں کو حاصل ہیں"۔

"لیکن باجی' بعض لوگ تو یہ مانتے ہی نہیں کہ فرشتہ نام کی کوئی مخلوق واقعی موجود ہے؟" فرقان نے کہا۔

"ان کی بات نہ کرو بھئی۔ وہ تو اس جاہل کی طرح ہیں جو اپنی جہالت کی وجہ سے بجلی اور ریڈیائی لہروں کا انکار کرتا ہے۔ غور کریں تو خدا اور فرشتوں کا انکار کرنے والے ایسے ہی جاہل ہیں۔ خدا کے فضل سے ہم مسلمان ہیں اور ہمارے لیے یہ بات لازمی ہے کہ سچے دل سے خدا کو مانیں' فرشتوں کو مانیں' قیامت کے دن پر ایمان لائیں اور یہ اقرار کریں کہ سب کچھ اللہ پاک ہی نے پیدا کیا ہے۔ سب کام اس کے حکم سے ہو رہے ہیں۔ وہی ہمیں روزی دیتا اور ہماری حفاظت کرتا ہے۔ میرے پیارے پیارے اچھے سے بھائی' اگر تم اپنے وعدے پر قائم رہے تو ان سب باتوں پر تمہیں اس طرح یقین آتا چلا جائے گا گویا تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو۔ تمہیں بے شمار برکتیں حاصل ہوں گی اور تم بہت شان دار زندگی گزارو گے۔ یہ بات تو ان شاء اللہ تمہیں دو چار دن ہی میں معلوم ہو جائے گی کہ تمہارے ساتھی تمہیں شیطان کہنا چھوڑ دیں گے۔ فرقان صاحب کہا کریں گے"۔

"بھئی واہ' گویا ہم فرقان صاحب بن جائیں گے"۔ فرقان نے ہنستے ہوئے کہا۔ وہ بہت خوش نظر آ رہا تھا۔

باجی کچھ اور کہنا چاہتی تھیں کہ دادا ابا گھر میں داخل ہوئے۔ انہوں نے پھلوں اور کھانے کی کئی مزے دار چیزوں کے لفافے اٹھا رکھے تھے۔ باجی نے انہیں دیکھا تو خوش ہو کر بولیں۔ "لو بھئی' اللہ کی رحمت کا پہلا ثبوت تو آج ہی مل گیا۔ دادا ابا یہ ساری چیزیں تمہارے لیے لائے ہیں۔ میں نے تمہارے روزے کا ان سے ذکر کیا تھا اور انہوں نے مجھے بتا دیا تھا کہ اگر ہمارے شیطان نے روزہ رکھا ہے تو افطاری کا سامان ہم خود لائیں گے۔ لو وہ لے آئے اور لگتا ہے بہت مزے مزے کی چیزیں لائے ہیں"۔

"پھر تو بھئی مزہ آ گیا" یہ کہتا ہوا فرقان دادا ابا کی طرف بھاگا جو بھاری لفافے بڑی مشکل سے سنبھال رہے تھے۔

...کے نرغے میں

نعیم بلوچ

یہ کام میں پہلی مرتبہ کرنے جا رہا ہوتا تو ضرور ڈرتا‘ لیکن اس سے پہلے بھی چار پانچ مرتبہ میں بنک سے ہزاروں کی رقم نکلوا چکا تھا۔ اور اب جب میرے باس نے مجھے ایک لاکھ دس ہزار کی رقم کا چیک کیش کروانے بھیجا تو میں بالکل نہیں گھبرایا تھا۔

لیکن واقعہ سنانے سے پہلے‘ میں آپ سے اپنا تعارف کروا دوں۔

میرا نام نذیر احمد ہے۔ جن دنوں کا یہ واقعہ ہے‘ اس وقت میں ایک پرائیویٹ کمپنی میں نائب قاصد تھا۔ یعنی چپراسی‘ میرا باس مجھ سے اندر باہر کے سارے کام لیتا تھا۔ میری عمر کچھ زیادہ نہیں تھی‘ لیکن میرے باپ نے میرے باس کی ساری عمر خدمت کی تھی۔ جب دفتر کے ایک کام کے دوران میں ہی حادثہ ہو گیا اور وہ فوت گئے تو میں اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر یہاں ملازم ہو گیا۔ میرا باس میری قدر کرتا تھا اور میں بھی اس پر اپنی جان نچھاور کرنے سے نہیں ہچکچاتا تھا۔

اس دن میرے باس یعنی قدیر صاحب نے مجھے بنک سے چیک کیش کروانے کے لیے بھیجا۔ رقم اگرچہ پہلے سے بڑی تھی لیکن قدیر صاحب کو میری ایمان داری اور صلاحیت پر بہت بھروسا تھا۔ دوسری بات یہ بھی تھی کہ ان کی گاڑی ان کا بیٹا لے گیا تھا ورنہ شاید وہ مجھے گاڑی پر بھیج دیتے۔ قصہ مختصر یہ کہ انہوں نے مجھے کہا۔

”نذیر‘ جاؤ سائیکل پر ہی جاؤ اور اس چیک کو کیش کروا لاؤ۔ میں بنک مینجر کو فون کر دوں گا‘ وہ تمہیں نوٹ ایک بنڈل میں ڈال دے گا۔ تم آرام سے اسے لے آنا! بڑی مشکل سے یہ چیک ملا ہے!“

میں نے ”بہت اچھا“ کہا اور اپنی بائی سکل پکڑی اور بنک پہنچ گیا۔ قدیر صاحب نے میرے پہنچنے سے پہلے ہی بنک مینجر کو فون کر دیا تھا۔ میں جیسے ہی بنک کی عمارت میں داخل ہوا گیٹ پر کھڑے‘ بندوق پکڑے‘ مونچھوں والے پہرے دار نے مجھے بنک مینجر کے کمرے کی طرف جانے کے لیے کہا۔ مینجر نے مجھ سے چیک لیا اور خود اس پر دستخط کر

دیے۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہزار ہزار کے نوٹوں کی ایک گڈی اور سو سو کے نوٹوں کی دوسری گڈی ان کی میز پر پہنچ گئی۔ منیجر صاحب نے خود ہی نوٹوں کو گنا۔ انھوں نے نوٹ بڑی تیزی سے گنے۔ پھر اپنے پاس سے انھوں نے خاکی رنگ کا ایک بڑا سا لفافہ نکالا اور نوٹ اس میں بند کر دیئے۔ یہ نوٹ اب ایک چھوٹی سی کتاب لگ رہے تھے۔ انھوں نے ایک کالے رنگ کا شاپر مجھے دیا اور کہا کہ نوٹوں کو اس میں ڈال کر سائیکل پر لٹکا لینا۔ پھر انھوں نے بندوق والے پہرے دار کو بلایا اور کہا کہ لڑکے کو احتیاط سے روانہ کر دو۔

پہرے دار نے ایک دفعہ باہر جا کر ادھر ادھر دیکھا۔ پھر مجھے جانے کا اشارہ کیا۔ میں نے منیجر صاحب کی ہدائت کے مطابق نوٹوں والا شاپر سائیکل کے ہینڈل کے ساتھ لٹکایا اور سائیکل پر سوار ہو کر دفتر کی طرف چل دیا۔

نہ جانے کیوں اچانک مجھے خوف سا محسوس ہونے لگا۔ دل میں یہ خیال آیا کہ اگر کوئی چور اچکا موٹر سائیکل یا گاڑی پر سوار میرے قریب آ کر نوٹوں سے بھرے لفافے کو چھین کر لے جائے تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ یہ خیال آتے ہی میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ جیسے واقعی کوئی میرا تعاقب کر رہا ہو۔ میں نے اپنے پیچھے ایک سرخ رنگ کی موٹر سائیکل دیکھی جس پر ایک لڑکا سوار تھا۔ موٹر سائیکل کی رفتار خاصی کم تھی۔ مگر اتنی بھی کم نہیں کہ وہ سائیکل سے پیچھے رہ جاتا۔ جلد ہی وہ مجھ سے آگے نکل گیا۔ لیکن میرے قریب سے گزرتے وقت اس نے ایک دفعہ غور سے میری طرف دیکھا تھا۔ چند گز آگے جا کر اس نے موٹر سائیکل روک لی۔ لگتا تھا کہ اس کی موٹر سائیکل خراب ہو گئی ہے۔ میں اس کے قریب سے گزر گیا۔ تھوڑی دیر بعد میں مین روڈ سے مڑ کر ایک چھوٹی سڑک پر آ گیا۔ مجھے ابھی سائیکل چلاتے چند منٹ ہی ہوئے ہوں گے کہ میں نے اسی موٹر سائیکل والے کو دیکھا۔ وہ خاصی سست رفتار سے میرے قریب سے گزر رہا تھا۔ پھر اچانک نہ جانے اسے کیا سوجھی کہ اس نے موٹر سائیکل مزید آہستہ کی اور میرے بالکل آگے آ گیا۔ میں اگر بریک نہ لگاتا تو یقیناً اس کی موٹر سائیکل سے ٹکرا کر گر پڑتا۔

اس کے میرے یوں آگے آ جانے کی کوئی وجہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ مجھے صاف یہ محسوس ہوا کہ اس نے مجھے جان بوجھ کر گرانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن بروقت بریک لگانے اور سائیکل کو سڑک سے نیچے اتار کر میں حادثے سے محفوظ رہا تھا۔ مگر اس کے باوجود وہ لڑکا مجھے گالیاں دینے لگا۔ وہ مجھے بھڑکا کر مجبور کر رہا تھا کہ میں اس سے الجھ پڑوں۔

لیکن میں اس کا سارا منصوبہ سمجھ چکا تھا۔ اگر وہ مجھے سائیکل سے گرانے میں کام یاب ہو جاتا تو ہمدردی جتانے پاس آتا اور بہانے سے روپوں سے بھرا شاپر ساتھ لے جاتا۔ اب وہ اپنی اس چال کی ناکامی کے بعد مجھ سے جھگڑا کرنا چاہتا تھا تاکہ میں اس سے الجھوں اور وہ رقم لے کر رفو چکر ہو جائے۔ میں نے اس کی گالیوں کی کوئی پروا

نہ کی اور تیزی سے سائیکل واپس موڑ لی اور پوری رفتار
سے اسے بھگانے لگا۔ وہ مجھے گالیاں دیتا رہ گیا۔
یہ بات نہیں تھی کہ مجھے اس کی گالیوں پر غصہ نہیں
آرہا تھا۔ لیکن میں نے سوچا کہ عقل مندی یہی ہے کہ
انسان اپنے غصے کا اظہار اس وقت کرے جب وہ دشمن کا
کچھ بگاڑ سکتا ہو اور اس وقت میں اس پوزیشن میں نہیں تھا
کہ اس اچکے لڑکے پر غصہ نکال سکتا اور اسے گالیوں کا مزا
چکھا سکتا۔

میں نے یہی فیصلہ کیا تھا کہ راستہ بدل کر دفتر پہنچوں
گا۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ بھی موٹر سائیکل واپس
موڑ رہا تھا۔ یہ میرے لیے بڑی پریشان کن بات تھی۔ میں
نے پیڈلوں پر مزید زور لگایا تاکہ رفتار تیز ہو۔ میں جلد از
جلد مین روڈ پر جانا چاہتا تھا۔ میرے کانوں میں لڑکے کی موٹر
سائیکل کی آواز بتدریج گہری ہوتی جا رہی تھی۔ میں بار بار
پیچھے مڑ کر دیکھ رہا تھا۔ ہم دونوں کا فاصلہ تیزی سے کم ہو رہا
تھا۔ اس کی موٹر سائیکل جو پہلے بہت آہستہ چلتی تھی اب
خوب بھاگ رہی تھی۔ یہ اس بات کا مزید ثبوت تھا کہ وہ
سارا ڈراما میرے لیے رچا رہا تھا۔

آخر میں مین روڈ پر پہنچ ہی گیا لیکن وہ نامعقول مجھ
سے بس چند فٹ ہی کے فاصلے پر تھا۔ اس موقع پر میرے
ذہن میں ایک اور ترکیب آئی۔ میں مین روڈ پر آکر اپنے
ہاتھ پر آگے جانے کے بجائے پیچھے کی طرف مڑ گیا۔ یعنی
ٹریفک کے بالکل الٹ۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اس
طرح موٹر سائیکل سوار سے میری جان چھوٹ سکتی تھی اور
دوسری وجہ یہ کہ ایک آدھ فرلانگ کے فاصلے پر ایک اور
سڑک میرے دفتر کی طرف جاتی تھی۔ یہ سڑک اگرچہ خاصی
سنسان اور خراب تھی لیکن یہاں سے دفتر کا فاصلہ کچھ کم
ہی تھا۔ میں چھوٹی چھوٹی گلیوں سے ہوتا ہوا اپنی منزل تک
پہنچ سکتا تھا۔ مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ پہلے مجھے یہ بات کیوں
نہ سوجی۔ خیراب پچھتانے سے کیا فائدہ!

دوسری طرف موٹر سائیکل والا میرے الٹے ہاتھ
مڑنے پر سخت جھنجلایا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو اس نے اپنی
موٹر سائیکل روک دی تھی۔ پھر وہ سیدھا آگے بڑھ گیا۔ میں
نے اللہ کا شکر ادا کیا اور احتیاط سے سائیکل چلانے لگا۔ اپنی
مطلوبہ سڑک کی طرف مڑنے کے بعد مجھے ایک اور خیال
آیا۔ میں نے سائیکل روکی۔ اپنے آگے پیچھے دیکھا۔ چند
ایک لوگ جو گزر رہے تھے وہ میری طرف متوجہ نہیں تھے۔
میں نے سڑک پر اڑتے ہوئے ایک گندے سے شاپر کو
پکڑا۔ سائیکل سڑک سے بالکل نیچے اتار کر اسٹینڈ پر کھڑی
کی۔ نوٹوں والے شاپر سے نوٹوں سے بھرا لفافہ نکالا اور
اسے سڑک سے ملنے والے شاپر میں ڈال لیا۔ اس شاپر کو
میں نے اپنی شلوار میں اڑس لیا۔ میں نے بڑی احتیاط سے
ایسا کیا تھا تاکہ یہ نوٹ کہیں گر نہ پڑیں۔ اب میں نے
سائیکل کے ہینڈل سے لٹکے ہوئے شاپر کو نیچے سے پھاڑ دیا
اور اسے دوبارہ وہیں لٹکا دیا۔ جہاں پہلے نوٹوں سے بھرا شاپر
لٹک رہا تھا۔ یہ کام کرنے کے بعد میں دوبارہ سائیکل پر سوار
ہوا اور اپنی منزل کی طرف چل دیا۔ میں نے اپنی رفتار تیز
ہی رکھی تھی۔

سائیکل چلاتے پانچ منٹ ہی ہوئے ہوں گے کہ مجھے
آگے سے ویسی ہی موٹر سائیکل آتی دکھائی دی جیسی موٹر
سائیکل پر سوار لڑکے نے مجھ سے الجھنے کی کوشش کی تھی۔
پہلے تو مجھے یوں لگا کہ یہ میرا وہم ہے لیکن غور سے دیکھا تو
یہ وہی کم بخت تھا۔ احتیاط کے پیش نظر میں رک گیا اور
سائیکل ایک طرف کھڑی کر کے ادھر ادھر یوں سڑک پر
دیکھنے لگا جیسے میری کوئی چیز گم ہو گئی ہو۔ مجھے یہ ڈراما کرتے
ابھی ایک آدھ منٹ ہی ہوا ہو گا کہ ایک کار والا میرے
قریب آکر رکا اور پوچھنے لگا "کیا تلاش کر رہے ہو؟" میں
نے رونی صورت بنائی اور سخت گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔
"میرے ضروری کاغذات کہیں گر پڑے ہیں"۔

کار سوار مجھ سے تفصیل پوچھنے لگا۔ اس نے میرا پھٹا
ہوا شاپر بھی دیکھا۔ میں حیران تھا کہ اسے بھلا مجھ سے اتنی
ہمدردی کیوں ہے۔ میں اسے ٹالنے لگا۔ اتنی دیر میں موٹر

سائیکل والا بھی وہاں پہنچ گیا۔ میرا اندازہ بالکل صحیح تھا۔ یہ وہی بدبخت تھا۔ وہ بھی ہمارے قریب آکر رک گیا۔ مجھ سے مخاطب ہونے کے بجائے وہ کار والے سے پوچھنے لگا کہ کیا ہوا؟ کار والے نے جب اسے یہ کہا "یہ خبیث رقم کہیں گرا چکا ہے" تو خوف سے میرے بدن میں ٹھنڈی لہریں دوڑ گئیں۔ میں ایک دم گھبرا گیا۔ میں اب دو دشمنوں کے نرغے میں تھا۔ کار والے کی بات اور بات کرنے کے انداز سے یہ واضح تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے واقف ہیں اور دونوں نے مل کر مجھے لوٹنے کا منصوبہ بنایا ہوا ہے۔ کار والے کا جواب سن کر موٹر سائیکل والا نیچے اترا اور میری طرف بڑھا۔ اس نے میرے ہاتھ سے وہ شاپر جھپٹ لیا جو میں نے سائیکل پر لٹکا چھوڑا تھا۔ اس کا اچھی طرح معاینہ کیا اور پھر وہ غصے سے میری طرف دیکھنے لگا۔ اچانک اس کا دایاں ہاتھ حرکت میں آیا اور ایک زور دار تھپڑ میرے منہ پر پڑا۔ مجھے زندگی میں اتنا غصہ کبھی نہیں آیا تھا۔ جی چاہتا تھا

کہ اس ذلیل شخص کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے کتوں کے آگے ڈال دوں۔ مگر بات پھر وہی تھی۔ دشمن پر وقت سے پہلے غصے کا اظہار کیا جائے تو نقصان خود ہی اٹھانا پڑتا ہے۔ میں دل پر جبر کر کے بس اپنا گال سہلاتے رہ گیا۔ اگر میں جواب میں اس پر حملہ کر دیتا تو شلوار میں اڑسے ایک لاکھ دس ہزار اس میں قدموں پر گر پڑتے اور یہ میری آخری اور حتمی شکست ہوتی۔ اس کے بجائے میں نے اپنا ذہن موٹر سائیکل اور کار کے نمبر یاد کرنے میں لگا دیا۔ پھر اچانک موٹر سائیکل والا بولا۔ "چل دفع ہو یہاں سے۔ سیدھا چلتا جا' مڑ کر دیکھا تو.... یہ دیکھو"۔

اس نے جیب سے پستول نکال لیا اور مجھ پر لہرانے لگا۔ میں خوف زدہ ہو کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ وہ دوبارہ بولا "چلو چلتے پھرتے نظر آؤ۔ مڑ کر بھی دیکھا تو سوراخ کر دوں گا گردن میں!"

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں! یعنی میں بھی تو یہی چاہتا تھا۔ فوراً سائیکل کی طرف لپکا مگر پھر خیال آیا کہ میرے یوں آرام سے رقم ڈھونڈے بغیر واپس جانے پر وہ کسی شک میں نہ پڑ جائیں۔ میں رکا اور لجاجت سے بولا "دیکھو' بابو صاحب' میں بہت غریب آدمی ہوں... خدا کے لیے...."

اس نے مجھے بات بھی پوری نہ کرنے دی اور چیخ کر بولا "دفع ہو جاؤ' غریب کے بچے! بھون ڈالوں گا ورنہ!" اس نے ایسا کہتے ہوئے پستول دوبارہ مجھ پر تان لیا تھا۔ میں نے دوسرا لفظ نہ بولا اور فوراً واپس ہو گیا۔ تیز تیز سائیکل چلاتا دفتر پہنچا تو پسینے سے شرابور ہو چکا تھا۔ سیدھا قدیر صاحب کے دفتر میں پہنچا۔ رقم ان کے حوالے کی اور ہانپتے کانپتے پوری بات سنا کر دم لیا۔

انہوں نے نوٹوں کی گڈی کو دیکھا۔ گڈی پر لگی بنک کی مہر کا معائنہ کیا اور اطمینان کا سانس لیتے ہوئے بولے "تم نے گاڑی کا نمبر کیا بتایا تھا"۔

"جی 9211- بڑا آسان نمبر ہے' وہ محاورہ ہے نا' نو دو گیارہ ہونا' اسی سے یاد ہو گیا!"
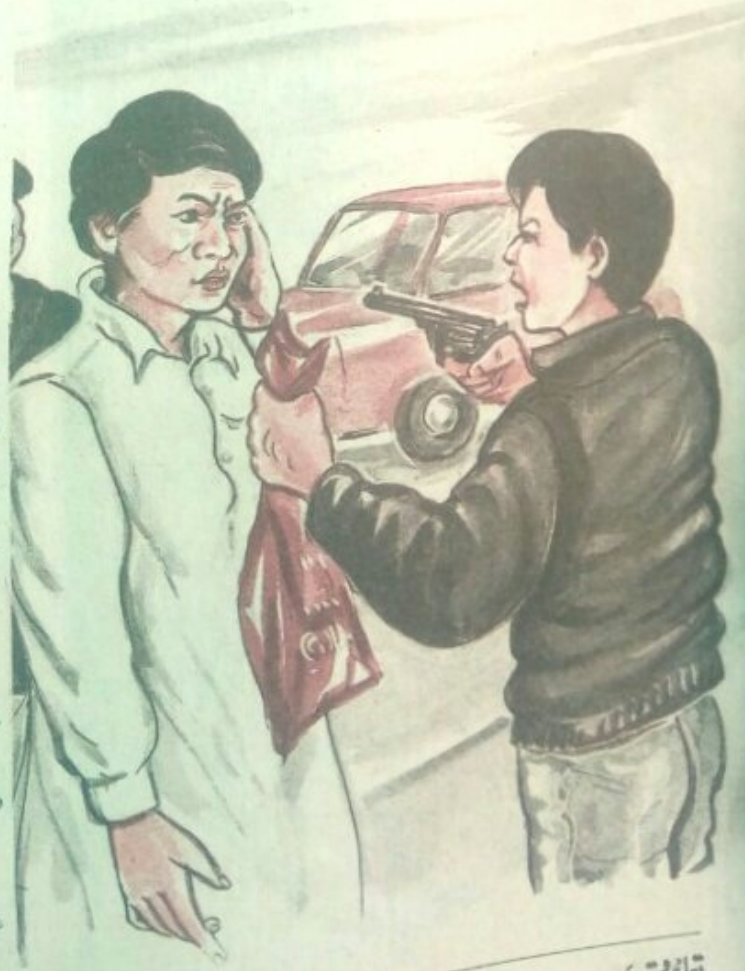
قدیر صاحب مسکرائے اور پھر اچانک بولے "اور گاڑی کا رنگ؟"

"جی سرخ رنگ کی تھی"۔

"وہی ہے بدبخت! اب اس کو نہیں چھوڑوں گا"۔ ان کے منہ سے بے ساختہ نکلا اور وہ فوراً فون کی طرف لپکے۔ میں نے بے صبروں کی طرح یہ سوال بالکل نہیں داغا کہ سر یہ کس بدبخت کی بات کر رہے ہیں آپ"

قدیر صاحب نے نمبر ملاتے ہوئے اچانک پوچھا "یہ گاڑی والا گنجا سا شخص تھا۔ میرا ہم عمر ہو گا۔ بھاری سی جسامت اور سانولے سے رنگ کا؟"

"جی سر! بالکل۔ اور اس کے ناک کے قریب بڑا سا کالے رنگ کا مسہ بھی تھا"۔

"ویری گڈ سو فی صد، وہی بدمعاش" وہ بڑبڑائے اور فون پر ہیلو کہہ کر بات کرنے لگے۔

انہوں نے قریبی تھانے میں فون کیا تھا۔ گفت گو کے انداز سے لگتا تھا کہ پولیس افسران کا جاننے والا ہے۔ پھر اچانک انہوں نے مجھ سے موٹر سائیکل والے کا بھی حلیہ پوچھا۔ فون سے تو یہی معلوم ہو رہا تھا کہ پولیس فوراً اسی

جگہ جا رہی ہے جہاں میں نے اپنے غصے پر قابو پا کر ان دونوں اچکوں کو چکمہ دیا تھا۔ کوئی آدھ گھنٹے کے بعد پولیس کی ایک گاڑی ہمارے دفتر آئی۔ اس گاڑی میں وہ دونوں آدمی موجود تھے جنہوں نے مجھ سے رقم چھیننے کی ناکام کوشش کی تھی۔ پولیس نے بتایا کہ گاڑی والا موٹر سائیکل کے ساتھ سڑک پر کچھ تلاش کر رہا تھا اور وہ اسے ڈانٹ بھی رہا تھا۔ پولیس نے میرا اور میرے باس قدیر صاحب کا بیان لیا۔ قدیر صاحب نے بتایا کہ گاڑی والا شخص وہی ہے جس نے انہیں ایک کاروباری سلسلے میں ایک لاکھ دس ہزار کا چیک بھجوایا تھا۔ یہ رقم پہلے ہی بڑے عرصے سے اس کی طرف ادھار چلی آرہی تھی۔ دراصل قدیر صاحب نے اس شخص کی بددیانتی کی وجہ سے اس کے ساتھ کاروبار بند کر دیا تھا اور وہ اسی وجہ سے انہیں رقم نہیں دے رہا تھا۔

پولیس انہیں ہتھ کڑی ڈال کر واپس جانے لگی تو قدیر صاحب نے موٹر سائیکل والے کو روکا اور پولیس کانسٹیبل کو اسے قریب لانے کے لیے کہا۔ جیسے ہی وہ ان کے قریب آیا انہوں نے ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے منہ پر رسید کیا۔

اس تھپڑ پر مجھے بہت خوشی ہوئی لیکن اس سے بھی زیادہ خوشی مجھے اس وقت ہوئی جب قدیر صاحب نے مجھے یہ خوش خبری سنائی کہ وہ میرے لیے اپنی جیب سے ایک استاد کا بندوبست کریں گے جو مجھے باقاعدہ پڑھائے گا۔ اور آج انہی کی عنایت اور اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے میں ان کی فرم میں نائب قاصد نہیں بلکہ ان کا اکاؤنٹنٹ ہوں۔
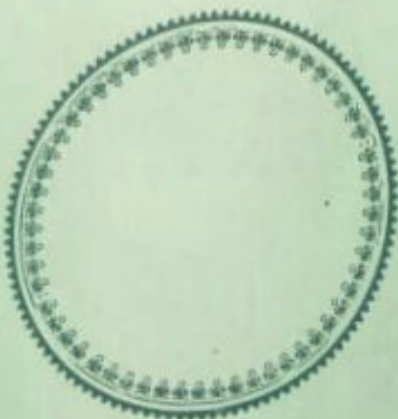
طیبہ ہاشمی

فاتح مشرق و مغرب

عجیب افراتفری کا عالم تھا۔ جنگ ابھی تک جاری تھی۔ گولوں کی گرج سے فضا گونج رہی تھی۔ باہر کھڑی حملہ آور فوج بڑی بے صبری سے اندر داخل ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسی اثنا میں ایک مضبوط اعصاب والا نوجوان اپنی فوج کے سپاہیوں کو پیچھے دھکیلتا ہوا بڑی دلیری سے بلند و بالا فصیل کو سیڑھی کے ذریعے پار کر کے اندر کود گیا۔ اس کی بہادری کو دیکھتے ہوئے چند اور سپاہی بھی اس کے پیچھے ہولئے۔ وہ نوجوان اندر داخل ہوتے ہی بھپرے ہوئے شیر کی مانند مخالف فوج کے سپاہیوں پر ٹوٹ پڑا۔ مخالف فوج کے ہر شاطر وار کو اپنی مضبوط ڈھال پر سہتا ہوا یہ بہادر آگے ہی آگے بڑھ رہا تھا۔ اسی اثنا میں کسی سمت سے ایک تیر سنسناتا ہوا آیا اور اس کے پھیپھڑے میں پیوست ہو گیا۔ اسے زخمی ہو کر گرتا دیکھ کر اس کے ساتھیوں نے اسے گھیرے میں لے لیا۔

باہر موجود سپاہی دروازہ توڑ کر اندر داخل ہو گئے' اور اس نوجوان کو اٹھا کر باہر لے آئے۔ سپاہیوں کی اس کے ساتھ والہانہ محبت اور ہمدردی سے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ یہ نوجوان فوج میں بڑا اہم مقام رکھتا ہے۔ اسے اٹھا کر جب باہر لایا گیا تو فوج میں اس کی موت کی افواہ پھیل گئی۔ جس سے خوف و ہراس پھیل گیا لیکن اس نوجوان نے ہوش میں آتے ہی اپنا ہاتھ ہلا کر اپنے زندہ ہونے کا بتایا۔ مرہم پٹی کے بعد جب اسے کیمپ میں لایا گیا تو اس کے ایک ساتھی نے نہایت ہمدردی کے ساتھ کہا "آپ کو ایک عام سپاہی کی طرح تنہا خطرے میں نہیں پڑنا چاہئے تھا"۔

سپاہی کے یہ الفاظ نوجوان کو بہت ناگوار گزرے۔ اس کے چہرے پر خفگی کے آثار دیکھ کر اس کے ایک اور ساتھی نے اس آدمی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "بہادروں کو بلند پایہ کارنامے سرانجام دینے کے لئے تکلیفیں اٹھانی ہی پڑتی ہیں"۔

یہ نوجوان جس کی بہادری اور شجاعت کے قصے ہزاروں سال گزرنے کے بعد آج بھی زبان زدعام ہیں' شاہ مقدونیہ فیلقوس (فلپ دوم) کا عظیم سپوت سکندر تھا۔ جس نے اپنی کم عمری میں ہی آدھی دنیا کو فتح کر لیا تھا' وہ 356 ق م میں شاہ فیلقوس اور ملکہ اولمپیاس کے ہاں پیدا ہوا۔ اس وقت ریاست مقدونیہ ایک الگ ریاست تھی' ملک یونان کا حصہ نہیں تھی لیکن آج کل یونان میں شامل ہے۔ سکندر سے شاہ فیلقوس کو غیر معمولی محبت تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کی تعلیم و تربیت اعلیٰ پایہ کی ہو۔ کیونکہ وہ اس کے شاندار مستقبل میں ریاست مقدونیہ کا تابناک مستقبل دیکھ رہا تھا۔ لہٰذا اس نے اپنے پیارے بیٹے کے لئے 343 ق م میں مشہور فلسفی اور حکیم "ارسطو" کو اس کا اتالیق (استاد) مقرر کیا اور کہا "جب میرا بیٹا پیدا ہوا تھا تو میں بہت خوش تھا مگر مجھے اس سے زیادہ خوشی یہ ہوئی ہے کہ وہ آپ کے زمانے میں پیدا ہوا ہے"۔

سکندر بڑا ذہین اور فرماں بردار شاگرد تھا۔ اس کی جسمانی تربیت پر بھی بھرپور توجہ دی گئی۔ اس طرح گھڑ سواری میں اس کا کوئی ثانی نہ تھا۔ خوب صورت نیلی آنکھوں والا سکندر انتہائی صاف گو اور پاک باز تھا۔ وہ دوستی کا نہ صرف قائل تھا بلکہ دوستوں پر بھرپور اعتماد بھی کرتا تھا۔ اپنے غصے پر قابو پانا اس کی

اچھی صفات میں سے ایک نمایاں صفت تھی۔ اسے اپنے کام سے بے پناہ محبت تھی۔ بلکہ کام کے وقت وہ اپنا آرام و سکون بھی بھول جاتا تھا۔

سکندر میں ایک خاص صفت یہ تھی کہ وہ وقت اور حالات دیکھ کر قدم اٹھاتا تھا۔ اگر ضرورت سر جھکانے کی ہوتی تو وہ اس میں بھی عار محسوس نہ کرتا تھا۔ اور اگر تلوار کی ضرورت پڑتی تو وہ اس سے بھی دریغ نہ کرتا تھا۔ کام کرتے وقت خود کو مشکل میں ڈال کر اس مشکل کو آسان کر دینا اسی کا خاصہ تھا۔

اپنے والد شاہ فیلقوس کے قتل (335ق م) کے بعد ریاست مقدونیہ کا بادشاہ بنا تو اس وقت اس کی عمر صرف بیس سال تھی۔ کسی کو سکندر کی اصل طاقت کا علم نہ تھا۔ اس کی کم عمری کی وجہ سے چار اطراف پھیلے دشمنوں کے حوصلے بلند ہو گئے تھے۔ مگر سکندر نے بہت جلد یہ باور کروا دیا کہ جو اس سے ٹکرانے کی غلطی کرے گا وہ خود ہی پاش پاش ہو جائے گا۔ اس نے تخت نشین ہوتے ہی جنگی مہمات کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اس کی جنگی قابلیت کو دیکھتے ہوئے انجمن ہمسائیگان نے اسے ایران جیسی وسیع و عریض سلطنت کی مہم کا سپہ سالار مقرر کر دیا۔ مگر ایشیا کی طرف پیش قدمی کرنے سے پہلے وہ شمالی اقوام کو شکست دینا چاہتا تھا۔ لہٰذا اس نے ایسا ہی کیا اور اس میں وہ کام یاب رہا۔ اب اس کے آگے فارس (ایران) جیسی عظیم سلطنت تھی۔ جو مقدونیہ کے مقابلے میں آبادی اور رقبے کے لحاظ سے کئی گنا بڑی تھی۔ مگر وہ اس سے خوف زدہ نہیں تھا۔ اس وقت فارس پر دارا کی حکومت تھی۔ سکندر کو شکست دینے کی خواہش اس کے دل میں ٹھاٹھیں مار رہی تھی۔

سکندر ایک تیز فہم نوجوان ہونے کے ساتھ ساتھ فنون حرب کا بھی ماہر تھا۔ دارا کی فوج سکندر کی فوج سے 20 گنا زیادہ تھی۔ سکندر کو اس بات کا احساس تھا۔ اس لئے اس نے اپنی فوج کو اس انداز میں ترتیب دیا کہ تعداد میں کم ہونے کی صورت میں بھی وہ ایرانی فوج پر سیاہ بادلوں کی طرح چھا گئی اور اس وقت تک غالب رہی جب تک ایرانی سلطنت کو انھوں نے فتح نہ کر لیا۔ یہ جنگ اربیلا کے مقام پر 333ق م میں لڑی گئی۔ دارا سکندر سے شکست کھا گیا اور میدان جنگ میں پیٹھ دکھا گیا۔ ایرانی دارالسلطنت پرسی پول پر قابض ہونے کے بعد وہ صور اور غزہ کو فتح کرتا ہوا مصر جا پہنچا اور اسے زیر کرنے کے بعد اس نے ایک نئے شہر کی بنیاد رکھی جس کا نام اس نے اپنے نام پر "سکندریہ" رکھا۔ سکندر کی یہ خاص بات تھی کہ وہ جس علاقے یا جس ملک کو بھی فتح کرتا وہاں اپنے نام پر یا اپنے کسی خاص کرم فرما کے نام پر ایک نئے شہر کی بنیاد رکھتا۔ اس نے اپنی 35 سالہ زندگی میں تقریباً ستر شہر آباد کئے جن میں سے چند ایسے شہر ہیں جو آج بھی اپنی اصلی حالت میں موجود ہیں۔

337ق م میں اس نے تقریباً ایک لاکھ بیس ہزار پیادہ اور پندرہ ہزار سوار فوج لے کر ہندوستان کا رخ کیا۔ ہندوستان کی طرف پیش قدمی کر کے وہ دنیا پر یہ ظاہر کر دینا چاہتا تھا کہ وہ ایک بہادر سپہ سالار اور ہرقل کا ہم پلہ ہے۔ ہرقل سکندر کا جد امجد اور یونانی سورما تھا۔ ہندوستان پہنچنے سے پہلے سکندر نے بخارا کے جنوبی مشرق میں تخدین کے پہاڑی قلعے کا محاصرہ کیا۔ جس پر اوکیاتمیں قابض تھا۔ اس قلعے کو ناقابل تسخیر خیال کیا جاتا تھا۔ قلعہ میں پناہ گزیں لوگوں نے سکندر کو طنزاً کہلا بھیجا کہ اگر اس قلعے کو فتح کرنا ہے تو پہلے اڑنا سیکھ لیں۔ اس بات نے سکندر کی شجاعت کو للکارا۔

اس نے یہ اعلان کیا کہ جو بھی اس قلعے کی چوٹی پر پہنچے گا اسے بھاری انعام سے نوازا جائے گا۔ اکثر نوجوانوں نے کوشش کی اور کام یاب رہے۔ اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے اوکیاتمیں نے شکست تسلیم کر لی۔ اس کے بعد سکندر کے کہنے پر اس نے اپنی بیٹی "روشنک" کی شادی سکندر سے کر دی۔ جس کے بطن سے ایک بیٹا پیدا ہوا۔ جس کا نام سکندر کے نام پر سکندر رکھا گیا۔

افغانستان میں اس نے قلعہ اردنوس پر قبضہ کیا جس کے بارے میں مشہور تھا کہ یہ قلعہ ہرقل بھی فتح نہیں کر سکا تھا۔ کابل اور باختر کو فتح کرنے کے بعد اسے ٹیکسلا کے راجا امبھی نے ہندوستان پر چڑھائی کی دعوت دی جو اس نے بخوشی قبول کر لی' کیونکہ وہ تو پہلے ہی ہندوستان کو فتح کرنے کا خواہاں تھا۔ امبھی کی دعوت سے اس کے ارادوں کو مزید تقویت حاصل ہوئی۔ ٹیکسلا

میں ایک ماہ کے قیام کے بعد اس نے ہندو راجا پورس (پورو) کی سلطنت پر چڑھائی کر دی۔ جس نے اس کی اطاعت قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ راجا پورس کی سلطنت دریائے چناب اور دریائے جہلم کے درمیان واقع تھی۔ راجا امبھی کی پانچ ہزار پیادہ اور سوار فوج بھی سکندر کے ہمراہ تھی۔ راجا پورس کو جب علم ہوا کہ راجا امبھی بھی اپنی فوج سمیت سکندر کے ساتھ اس پر چڑھائی کرنے نکل کھڑا ہوا ہے تو اس نے اپنی فوج کو مستحکم بنانے کے لئے مزید اقدامات کئے اور چالیس ہزار فوج لے کر سکندر کے مقابلے کے لئے تیار ہو گیا۔

پورس بھی ایک جری اور بہادر راجا تھا۔ اور اس کی بہادری کا بہت شہرہ تھا۔ دونوں فوجی دستے دریائے جہلم کے کنارے ایک ماہ تک آمنے سامنے رہے۔ آخر کار سکندر اپنی فوج کے نصف سے زیادہ حصے کو لے کر ایسے مقام پر پہنچ گیا جہاں سے وہ ہندی فوج کی نظروں سے بچ کر دریا پار کر سکتا تھا۔ لیکن اس نے اپنی فوج کا کچھ حصہ کراتیروس کی قیادت میں ہندی فوج کے روبرو رہنے دیا۔ تاکہ اسے شبہ نہ ہو اور خود پیچھے سے جا کر ہندی فوج پر دھاوا بول دیا۔

دراصل ہندی فوج اس اچانک حملے سے قطعی بے خبر تھی۔ جب پورس کو علم ہوا تو اس نے اپنے بیٹے کی کمان میں یونانی فوج کی مزاحمت کے لئے ایک فوجی دستہ روانہ کیا۔ مگر اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ سکندر تو ان کے سر پر آ پہنچا تھا۔ پھر دریائے جہلم کے کنارے ایک تاریخی جنگ ہوئی اور ہمیشہ کی طرح کامیابی نے سکندر ہی کے قدم چومے۔

پورس کے دو بیٹوں سمیت ہندی فوج کے 20 ہزار فوجی اور سو کے قریب ہاتھی مارے گئے۔ ہندی فوج کے 9 ہزار افراد کو قیدی بنا لیا گیا۔ جہاں ہندی فوج کے 20 ہزار جوان کام آئے وہاں یونانی فوج کے صرف ایک ہزار افراد مارے گئے۔ ہندی فوج کے ہاتھی یونانی حملے سے خوف زدہ ہو کر اپنے ہی آدمیوں کو کچلنے لگے آخر جب پورس کو قیدی بنا کر سکندر کے روبرو لایا گیا تو سکندر کے اس سوال پر کہ اس کے ساتھ کیسا سلوک کیا جائے؟ اس نے ایک تاریخی جملہ کہا۔

"ویسا ہی جیسا کسی بادشاہ کے ساتھ کیا جاتا ہے"۔

سکندر چونکہ خود بہادر تھا اور بہادروں کی حوصلہ افزائی بھی کیا کرتا تھا۔ اسے پورس کی یہ بات بہت پسند آئی۔ اس نے نہ صرف اسے چھوڑ دیا بلکہ اس کی ساری سلطنت مزید اضافے کے ساتھ واپس کر دی۔

اس کے بعد اس نے مشرق کا رخ کیا۔ دریائے راوی اور چناب کو پار کر کے آگے بڑھا۔ یہاں اس نے قلعہ سنگالا کو فتح کیا۔ دریائے بیاس کو پار کرنے کے بعد وہ دریائے ستلج کو بھی پار کرنا چاہتا تھا۔ تاکہ وہ ہندوستان کے مزید اندر جا سکے۔ لیکن اس کی تھکی ہاری فوج نے مزید قدم بڑھانے سے انکار کر دیا اور واپسی کا علم بلند کر دیا۔ سکندر کی لاکھ کوششوں کے باوجود اس کی فوج نے اپنا واپسی کا مطالبہ واپس نہ لیا' کیونکہ انھیں اپنے ملک سے باہر آئے 8 سال کا طویل عرصہ گزر چکا تھا۔ اب وہ واپس اپنے گھروں کو جانا چاہتے تھے جہاں ان کے پیارے ان کے انتظار میں آنکھیں بچھائے ہوئے تھے۔

آخر کار سکندر نے ان کے مطالبے کے آگے ہتھیار ڈال دیئے۔ سکندر کا اس مطالبے کو مان لینا سبھی کے لئے حیران کن بات تھی کہ اس جیسا سخت اور اڑیل نظر آنے والا جرنیل اپنی فوج کا یہ مطالبہ مان گیا ہے۔ اس طرح سکندر فاتح ہند بننے کی حسرت دل میں ہی لئے واپس ہو لیا۔ لہٰذا وہ دریائے سندھ کو پار کرنے کے بعد مکران اور خلیج فارس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے انتہائی تھکا دینے والی مسافت طے کرنے کے بعد ہمدان پہنچا۔

جہاں اس کے عزیز ترین دوست ہفائیستوں کا انتقال ہو گیا۔ اس کا سکندر کو بہت دکھ ہوا۔ وہ اس کا جسد خاکی لے کر بابل چلا گیا۔ جہاں اس نے اس کی آخری رسومات پر دس ہزار تالنت (تقریباً" 4 کروڑ روپے) کی کثیر رقم خرچ کی۔ ہفائیستوں کی موت کا سکندر نے بہت اثر لیا اور چند دن بخار میں مبتلا رہنے کے بعد بابل میں 323 ق م کو اپنے مالک حقیقی سے جا ملا۔ یوں پوری دنیا کو فتح کرنے کا خواب دیکھنے والا عظیم جرنیل اس دنیا سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گیا۔

جذبہ

نجمہ معراج

کاشی کی آنکھ کھلی تو سارے کمرے میں اندھیرا تھا۔ اس نے گھپ اندھیرے میں چلتے ہوئے تھوڑا آگے ہو کر اندازے سے میز پہ ایک دو جگہ ہاتھ مارا تو اس کے ہاتھ میں ماچس آ گئی۔ اس نے چارپائی کے نیچے سے موم بتی اٹھائی اور جلا کر میز پر رکھ دی۔ "آہ یہ بجلی پتا نہیں کب کی گئی ہوئی ہے"۔ اس نے اپنی عینک پکڑتے ہوئے کہا اور عینک ناک پہ رکھتے ہوئے سامنے دیوار پر لگے کلاک پر نظر دوڑائی۔ رات کا ایک بج رہا تھا۔

کاشی کی عمر کوئی زیادہ نہ تھی۔ ابھی وہ صرف دس سال کا ہی تو تھا۔ مگر اس ننھی سی عمر میں خدا نے اسے اس دنیا پر اکیلا کر دیا تھا۔ یک دم بادل گرجنے کی آواز سنائی دی۔ اندھیری رات' بارش' گرج اور چمک۔ کاشی اس صورت حال سے بہت خوف کھا رہا تھا۔ وہ بار بار یہی سوچ رہا تھا کہ چچا کے گھر چلا جاؤں۔ مگر جب بھی دروازہ کھول کر دیکھتا تو باہر اولے پڑ رہے ہوتے۔ وہ پھر سے دروازہ بند کر کے پیر سمیٹ کر اپنی چارپائی پر بیٹھ جاتا۔ جب بھی گرج اور چمک سے اس کا ذہن ہٹتا تو اس کا خیال اپنے بہن بھائیوں اور ماں باپ کی طرف چلا جاتا جو اب اس دنیا میں نہ تھے۔ اداسی اس کے چہرے پر ڈیرے ڈال لیتی اور وہ یہ سوچنے لگتا "اگر میرا باپ نشہ نہ کرتا تو اس وقت کمرے میں جو چارپائیاں خالی پڑی ہیں ان پہ میرے بہن بھائی اور والدین سو رہے ہوتے۔ پھر میں بھی اس خوف ناک طوفان سے دہشت نہ کھاتا۔ اب میں نشہ کی لعنت کے قریب بھی نہیں پھٹکوں گا۔ اللہ کرے کہ اس دنیا سے نشے کی لعنت ختم ہو جائے تاکہ آئندہ کوئی کاشی دنیا کے اس طوفان میں میری طرح تنہا نہ رہ رہے۔ میرے ابو نشے کی وجہ سے امی کی بیماری کی طرف توجہ نہ دیتے تھے۔ اس طرح وہ میری بہن کی پیدائش کے تیسرے دن اس دنیا سے کوچ کر گئیں اور میری ننھی منی پیاری سی بہن جس کی عمر ابھی صرف چھ دن تھی' وہ بھی اپنی ماں سے جا ملی۔

عامی' میرا بڑا بھائی' قریب کے شہر میں پڑھنے جاتا تھا۔ ایک دن ابو جی نے زیادہ نشہ کر لیا۔ جس کی وجہ سے ان کی حالت کافی خراب ہو گئی۔ عامی نے سوچا کہ ابو جی کو شہر کے کسی ہسپتال میں لے جایا جائے۔ اس نے ابو جی کو بڑی مشکل سے پکڑ کر سائیکل کے پیچھے بٹھا لیا۔ مگر سڑک عبور کرتے وقت سڑک کے عین درمیان میں ابو جی سائیکل سے گر گئے اور عامی بھائی بھی اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکے۔ وہ اپنی سائیکل سمیت سڑک کے درمیان میں گر گئے۔ ابھی وہ سنبھل بھی نہیں پائے تھے کہ ایک تیز رفتار بس ان دونوں کو بچانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے ان کے اوپر سے گزر گئی۔ وہ دونوں بھی اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ یہ ایک سال پہلے کا ہی تو واقعہ ہے"۔ پھر کاشی کے ذہن میں گزرے ہوئے کل کے واقعات آنے لگے۔ وہ سوچنے لگا کہ کل جب میں اسکول جا رہا تھا تو دو عورتیں باتیں کر رہی تھیں کہ "یہ لڑکا بھی ایک سال نہیں تو دو سال اور پڑھے گا اور پھر اپنے آباؤ اجداد کی طرح نشے پر لگ جائے گا"۔

کاشی نے دل ہی دل میں سوچا کہ اس کے چچا بھی تو اسی کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ تو نشہ نہیں کرتے۔ میرے چچا زاد تین بہن بھائی ہیں۔ ایک بہن اور دو بھائی۔ وہ تینوں ہی اپنی اپنی جماعت میں ہر سال اول آتے ہیں۔ میرے چچا بہت اچھے ڈینٹل سرجن ہیں۔ صرف میرے ابو جی ہی نشہ کرتے تھے یا تھوڑا بہت دادا جان کر لیتے ہیں۔ صرف ان دو افراد کی وجہ سے پورا خاندان بدنام ہو گیا ہے۔ پھر اس نے سوچا کہ میں بھی چچا کی طرح ڈاکٹر بنوں گا۔

انہیں سوچوں میں نہ جانے کب کاشی کو نیند آ گئی۔ صبح آنکھ کھلی تو آندھی' طوفان' اور موسلا دھار بارش کے بعد اب آسمان بالکل صاف تھا۔ بارش سے گھر بار سب کچھ دھل چکا تھا۔ اس نے منہ ہاتھ دھو کر دانت صاف کئے اور پھر رات کی پڑی

ہوئی روٹی کھانے لگا۔ آج اسکول میں چھٹی تھی۔ کھانا کھانے کے بعد اس نے سوچا کہ چچا کے گھر چلتا ہوں۔ وہاں دادا ابو سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔ یہ سوچ کر وہ اپنے چچا کے گھر کی طرف چل پڑا۔ ابھی اس نے چچا کے گھر میں قدم رکھا ہی تھا کہ چچی جان بولیں "ارے کاشی بیٹا گھر میں بیٹھے کیوں سوکھی روٹیاں چباتے رہتے ہو۔ ادھر آجاؤ اور نہیں تو کم از کم اچھی روٹی تو کھالیا کرو گے۔ یوں سوکھ سوکھ کر کب تک کانٹا بنتے رہو گے"۔

کاشی نے دل میں سوچا کہ عزت کی سوکھی روٹی ہی ملتی رہے تو کافی ہے۔ وہ اسکول کے بعد گھر آنے کی بجائے ایک دکان دار کے پاس کام کرتا۔ اس طرح کچھ پیسے کما لیتا۔ ان پیسوں سے وہ اپنی گزر اوقات کرتا۔ چچی جان سے علیک سلیک کرنے کے بعد وہ تھوڑا آگے بڑا تو اسے دادا ابو نظر آئے۔ دادا ابو اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کے گھر رہتے تھے۔ وہ خود حقہ' اور پوست کی چائے پیتے تھے مگر باقی سب کو یہ کہتے تھے کہ میں تو عادت کے ہاتھوں مجبور ہوں مگر دوسرا کوئی اس لعنت کے قریب بھی نہ پھٹکنے پائے۔

کاشی نے دادا ابو کو سلام کیا۔ وہ سلام کا جواب دیے بغیر ہی بولے "کاشی پتر' یہ لو پوست کے ڈوڈے اور مجھے اس کی چائے بنا دو۔ صبح سے کسی کو اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ مجھے حقہ ڈال دے اور پوست کی چائے بنا دے۔ اور ہاں دیکھنا کہیں حقے کا کش نہ لگا لینا اور نہ ہی چائے کی کوئی چسکی لینا۔ بیٹا' یہ موذی نشہ ایسی خبیث شے ہے کہ جسے لگ جاتی ہے اسے زندہ درگور کر دیتی ہے"۔

کاشی کا دل تو بہت چاہا کہ جس نے اس کا خاندان تباہ کر دیا ہے دادا ابو کو اس نشے سے باز رہنے کے لیے کے انہیں کھری کھری سنائے' پوست کے ڈوڈے دور پھینک دے اور حقے کے حصے بکھرے کر ڈالے۔ لیکن وہ دادا ابو کا کہنا ٹال نہیں سکتا تھا۔ اس نے دادا ابو کو پوست کی چائے بنا کر دی اور حقہ تازہ کر کے دیا۔ پھر حسب معمول چچی جان سے گالیاں بھی سنیں کہ یہ کاشی کا بچہ ابا جی کی عادتیں خراب کر کے چلا جاتا ہے۔ کاشی نے چچی جان کی ڈانٹ ڈپٹ کا کوئی اثر نہ لیا اور واپس اپنے گھر کو ہو لیا۔

آج بہت گرمی تھی۔ گھر میں پنکھا بھی نہیں تھا اور بارش کے بعد حبس بہت بڑھ گیا تھا۔ کاشی نے جائے نماز اور اپنا اسکول بیگ اٹھایا اور کچھ دور ایک باغ میں آم کے درخت کی ٹھنڈی چھاؤں میں ہوم ورک کرنے کے لیے بیٹھ گیا۔ سارا دن درخت سے پکے ہوئے آم گرتے رہے لیکن کاشی کے دل میں ذرا برابر لالچ نہ آیا۔ وہ مطالعہ میں اس قدر مگن تھا کہ کسی آنے جانے والے کی اسے بالکل خبر نہ تھی۔ شام کو دن ڈھلے جب باغ کا مالی ادھر آم اکٹھے کرنے آیا تو اسے بڑی حیرت ہوئی کہ ایک بچہ اپنی کتاب پر نظر جمائے بیٹھا ہے اور اس نے کوئی آم نہیں کھایا۔ پھر مالی کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ اس کے قریب جا کر دیکھے کہ اتنا اچھا بچہ کس کا ہے۔ مالی نے اس کے آگے آکر دیکھا تو کہنے لگا "اچھا یہ تو کاشی ہے۔ نور الٰہی کا بیٹا' اسی نشی کا' ہاہا" وہ قہقہ مار کر ہنسا اور کہنے لگا "یہ خاک پڑھے گا۔ اپنے باپ دادا کی طرح
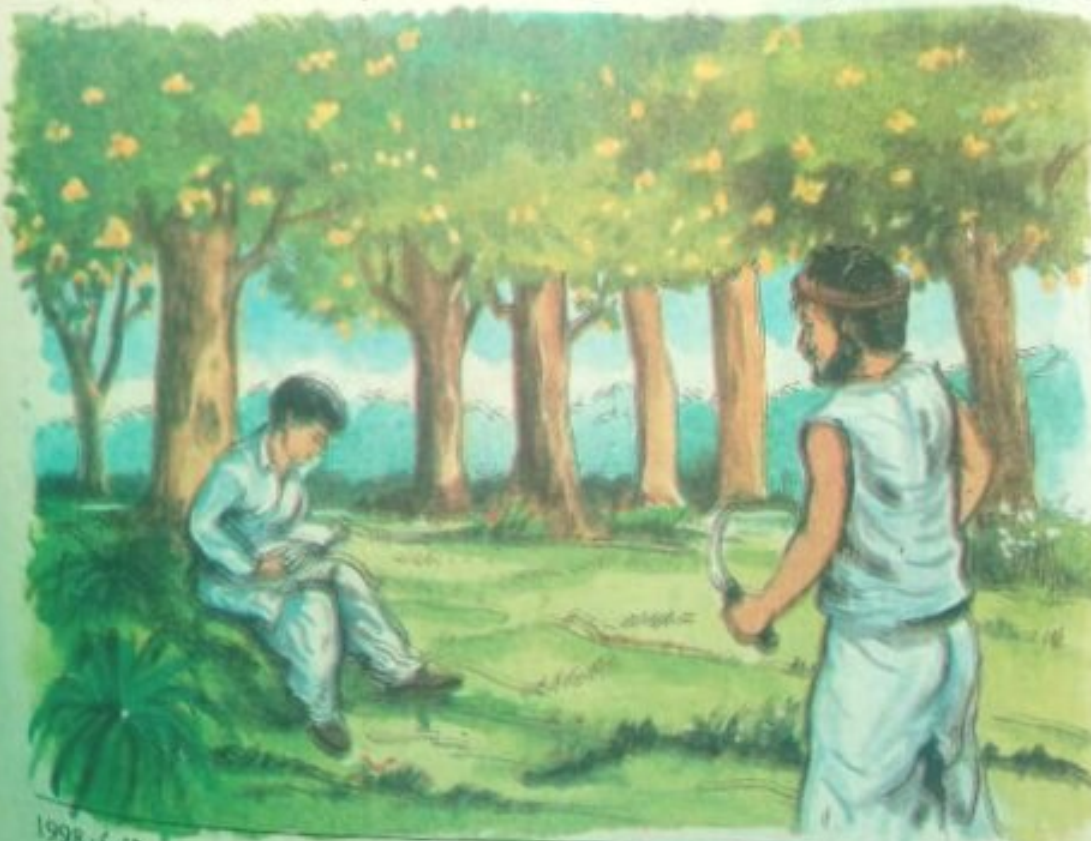
نشہ ہی کرے گا۔ آج نہیں تو کل لوگ اس کا انجام اس کے باپ کی طرح کسی سڑک کے درمیان میں دیکھیں گے"۔

کاشی نے کہا "سچ کہ رہے ہیں آپ مالی چچا' نشہ کرنے والوں کا واقعی یہی انجام ہوتا ہے۔ وہ اس لعنت سے خود ہی برباد نہیں ہوتے بلکہ دوسروں کو بھی لے ڈوبتے ہیں اور خاندان بھر کے لیے بدنامی کا باعث بنتے ہیں۔ میں ان شاء اللہ نشہ نہیں کروں گا اور پڑھ لکھ کر ڈاکٹر بنوں گا"۔

"بیٹا جی' یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ماں پہ پوت پتا پہ گھوڑا' بہت نہیں تو تھوڑا تھوڑا" باغ کا مالی یہ کہ کر چلا گیا۔ سورج غروب ہونے والا تھا۔ پرندے مل کر چہچہانے لگے تھے۔ کاشی نے اپنی کتابوں کو سمیٹا اور گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

دن گزرنے لگے۔ کاشی خوب محنت سے پڑھتا رہا۔ اس نے دل میں یہ عزم کر رکھا تھا کہ وہ اپنے خاندان کو جو نشے کی وجہ سے بدنام ہو چکا ہے پھر سے نامور بنائے گا۔ کاشی میٹرک میں فرسٹ آیا۔ اسے گورنمنٹ کی طرف سے وظیفہ اور صدارتی ایوارڈ بھی ملا۔ پھر اس نے ایف ایس سی میں داخلہ لے لیا۔ وقت گزرتے ہوئے پتا بھی نہ چلا۔ کاشی اب میڈیکل کالج میں داخل ہو چکا تھا۔ پانچ سال کے بعد وہ ایم بی بی ایس کی ڈگری امتیازی حیثیت سے حاصل کرنے میں کام یاب ہو گیا۔ وہ اپنے گاؤں کے قریب کے قصبے میں موجود سرکاری ہسپتال میں ڈاکٹر لگ گیا۔ یوں وہ دکھی انسانیت کی خدمت کرنے لگا۔ اس نے پرائیویٹ طور پر انسداد منشیات کی ایک تنظیم بنائی۔ اس تنظیم کا مقصد نشہ آور اشیا کی خرید و فروخت کے خلاف جہاد کرنا اور نشے کے عادی لوگوں کا علاج کرنا تھا۔ اس طرح اب تک وہ سینکڑوں لوگوں کو اس لعنت سے محفوظ رکھنے میں کام یاب ہو چکا تھا۔ لوگ اس کے گن گاتے تھے اور اکثر لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سنا تھا کہ شریف خاندان کے چشم و چراغ سے یہی امید تھی۔ ڈاکٹر صاحب کے آباؤ اجداد بھی برائی کے خلاف اسی طرح برسرپیکار ہو جایا کرتے تھے۔

ایک دن کا ذکر ہے۔ ڈاکٹر کاشف نور عرف کاشی اپنے کلینک میں بیٹھے تھے۔ رات شدید ژالہ باری ہوئی تھی مگر اب مطلع صاف ہو چکا تھا مگر حبس کافی ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر کاشف نے ہوا باہر پھینکنے والا پنکھا لگایا ہوا تھا۔ یہ موسم اسے اس وقت کی یاد دلا رہا تھا جب وہ دنیا میں تماشہ بن کر رہ گیا تھا۔ وہ بے یار و مددگار تھا۔ لوگوں کی کڑوی کسیلی باتیں اس کا مقدر بن گئی تھیں۔ اسی دن کا ذکر ہے کہ گاؤں میں موجود ایک مالی بابا بخار سے نڈھال ہو رہا تھا۔ اس کا بیٹا اسے تانگے پر قریبی قصبے میں لایا تاکہ سرکاری ہسپتال سے دوائی لی جا سکے۔ مالی بابا کے بیٹے نے اپنے باپ کو ہسپتال کے باہر تانگے سے اتارا اور ڈاکٹر کے کمرے میں لے آیا۔ کمرے کے باہر نیم پلیٹ پر "میڈیکل آفیسر' ڈاکٹر کاشف نور لکھا ہوا تھا۔ یہ کاشی کا کمرا تھا اور مالی بابا اسی کے گاؤں سے آیا تھا۔ کاشی نے گاؤں کے مالی بابا کو اچھی طرح کر چیک کیا اور خود ٹھنڈے پانی کی پٹیاں کیں۔ مالی بابا کا بخار ہلکا ہوا تو اس نے ڈاکٹر کاشف نور کو پہچان لیا۔ مالی بابا کہنے لگے "بیٹا تم کاشی ہو"۔

"جی بابا جی میں کاشی ہی ہوں۔ نور الٰہی کا بیٹا۔ ظہور الٰہی کا پوتا اور ہاں آپ کا بھی تو بیٹا ہی ہوں۔ میرے لائق کوئی اور خدمت ہو تو مجھے ضرور بتائیے"۔

مالی بابا شرمندہ ہو کر بولے "کاشی بیٹے' میں نے جو بات آج سے چند سال پہلے آپ کو باغ میں کہی تھی وہ مجھے معاف کر دو۔ آپ کا جذبہ واقعی سچا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور خوشیاں دے۔ بیٹا' اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہت صلاحیتیں دے رکھی ہیں۔ وہ جس کام کا پختہ ارادہ کرے وہ کر گزرتا ہے۔ آپ نے ڈاکٹر بننے کا سچے دل سے پختہ ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو ڈاکٹر بنا دیا۔

واقعی آپ جیسے ہونہار بچے ہی اپنا اور اپنے خاندان کا نام روشن کرتے ہیں۔ جن کے پختہ ارادوں کو گھر کا ماحول اور لوگوں کے طعنے بھی تبدیل نہیں کر سکتے"۔ مالی بابا بڑے جذباتی انداز میں بول رہا تھا مگر ڈاکٹر کاشف نور نے اس کے کندھے تھپ تھپاتے ہوئے کہا "بابا جی! آپ کی صحت اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ آپ اونچی آواز میں بولیں"۔

مالی بابا کاشی کے کہنے پر خاموش تو ہو گئے تھے مگر ان کے چہرے پر کاشی کے بارے میں نیک جذبات پوری طرح دیکھے جا سکتے تھے۔

پورا روزہ

بخت رسا

ویسے تو ناصر بھائی انجینئرنگ پڑھ رہے ہیں لیکن کوئی پچھلے چار پانچ ماہ سے انہیں طب سے کچھ خاص ہی لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ اور اپنے اسی شوق کے پیش نظر انہوں نے پرانی کتابوں کی دکانوں سے چند عدد دیمک زدہ کتابیں اور اخباری کاغذ پر چھپنے والے کتابچے خرید ڈالے تھے۔ انہیں وہ حکمت کے انتہائی نادر نسخے گردانتے تھے۔ اس کے علاوہ ان کے دوستوں میں انہی کے جیسے ایک دو "نیم حکیم" بھی شامل ہو چکے تھے۔ جن کے بتائے ہوئے کچھ کام یاب اور معقول اور بیشتر انتہائی نامعقول اور ناکام قسم کے نسخے بھائی صاحب خود بھی آزماتے رہے تھے۔

پہلے پہل تو ناصر بھائی نے "غذا سے علاج" کے نسخوں پر زور دینا شروع کیا مثلاً شہد دودھ کے ساتھ استعمال کرنے کا کیا فائدہ ہے۔ اگر پانی میں ڈالا جائے تو کیسے کار آمد ہے، زکام میں دار چینی کیسے کام آتی ہے اور ادرک کیا کمال دکھاتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

ان کے یہ نسخے خاصے کار آمد اور قابل عمل تھے۔ اور چونکہ آزمودہ تھے اس لیے فائدہ مند بھی ثابت ہوئے۔ بس پھر کیا تھا، ناصر بھائی خود کو حکیم لقمان نہ سہی، حکیم جالینوس ضرور سمجھنے لگے تھے۔ اور اپنے ان تجربات میں وہ نہ صرف باورچی خانے کے بلکہ گھر کے ہر برتن، اوزار اور مشین کو بے دھڑک استعمال کرتے۔

آج جنوری کی یکم تھی اور پہلا روزہ بھی تھا۔ میرے چچا زاد بھائی عمر اور میرے علاوہ گھر میں سبھی کا روزہ تھا۔ ویسے تو ہم دونوں نے بھی سحری کے وقت باقی سب گھر والوں کے ساتھ ہی کھانا کھایا تھا۔ اسی لیے شاید ناشتا نہ کیا تھا۔ لیکن جو بسکٹ ہمیں اسکول میں آدھی چھٹی میں کھانے کو دیئے گئے تھے، عمر نے نہ تو وہ مجھے کھانے دیئے اور نہ ہی خود کھائے۔ "ارے پاگل! روزہ ہے ہمارا، پانی بھی نہیں پینا! سمجھیں!" وہ لنچ بکس واپس بستے میں رکھتے ہوئے زور سے بولا۔ لیکن اسکول سے واپسی تک وہ خود بھی بھوک سے نڈھال ہو چکا تھا۔ گھر آتے ہی غٹاغٹ پانی کے دو گلاس پینے کے بعد آرام سے کھانے کی میز پر بیٹھ کر کھانا کھانے لگا۔ پھر

کھانے کے دوران میں اچانک ہی اونچی آواز میں رونے لگا۔

"کیوں رو رہے ہو؟" میں نے سٹ پٹا کر پوچھا۔

"امی نے مجھے کھانا کھلا دیا ہے! میرا تو روزہ تھا" وہ روتے روتے بولا۔

"اوہو عمر بچوں کا تو آدھا روزہ ہوتا ہے' سحری سے دوپہر کے کھانے تک کا" چچی جان اسے پیار کرتے ہوئے بولیں۔

"مگر کل میں پورا روزہ رکھوں گا" عمر آنسو پونچھتے ہوئے بولا۔

"اچھا' اچھا' مگر ابھی تو کھانا کھا لو نا بیٹے" امی جان مسالہ پیسنے کی مشین صاف کرتے ہوئے بولیں۔ اسی وقت وہاں ناصر بھائی آ گئے۔ امی کے ہاتھ میں مسالہ پیسنے کی مشین دیکھ کر ان کی باچھیں کھل گئیں۔ "واہ امی جان' آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ میں گیلی میتھی اسی میں پیسوں گا" ناصر بھائی نے کہا۔

"خبردار ناصر' تم نے نہ جانے پہلے ہی اس میں کون سی معجون بنانے کی کوشش کی تھی۔ اس قدر بدبو آ رہی تھی۔ بہت مشکل سے صاف کی ہے میں نے یہ" امی نے سختی سے ان کے ہاتھ سے مشین کی پیالی لیتے ہوئے ڈانٹا تو وہ منہ بسورنے لگے۔ پھر ان کی نظر چچی جان کے چہرے پر پڑی تو وہ بولے "او ہاں! چچی جان' میں آپ کو چہرے پر پڑنے والے نشانوں کے لئے مرہم بنا کر دوں گا۔ وہ بہت فائدہ مند ثابت ہوگا"۔

"ضرور' ضرور" چچی جان نے عمر کے چھوٹے بھائی ابراہیم کے بال سنوارتے ہوئے جواب دیا' پھر شرارت سے بولیں "بھئی ناصر' تمہارے پاس کوئی ایسا نسخہ نہیں جس سے ابراہیم کے بال کچھ گھنے ہو جائیں"۔

"ہوں' ہوں! کیوں نہیں۔ میں دیکھتا ہوں" ناصر بھائی نے بہت پرسوچ انداز میں کہا اور کچھ یاد کرتے کرتے اپنے کمرے کی طرف چل دیے۔

کچھ دن بعد ناصر بھائی' عمر اور میں گھر کے باغ میں بیٹھے تھے۔ ناصر بھائی کے ہاتھ میں خلاف معمول اپنے کورس کی کوئی کتاب تھی لیکن ان کی نظر پھولوں سے لدی گلاب کی ٹہنیوں پر تھی۔

اتنے میں برابر والے ڈاکٹر انکل نے ناصر بھائی کو آواز دی۔ "جی! فرمایئے انکل" ناصر بھائی بہت سعادت مندی سے دونوں گھروں کے درمیان بنی آدھی دیوار پر چڑھ کر بولے۔

"یار' دیکھو یہ گاڑی پھر سے گڑبڑ کر رہی ہے"۔ اپنی پرانی سی کار کے پاس کھڑے ڈاکٹر انکل بے زاری سے بولے تو ناصر بھائی دیوار سے کود کر ان کے ساتھ گاڑی کے انجن کا بغور جائزہ لینے لگے۔ عمر اور میں بھی یہ تماشا دیکھنے کے لیے دیوار پر چڑھ گئے۔ ناصر بھائی کافی دیر انجن کے مختلف کل پرزوں کے ساتھ چھیڑ خانی کرتے رہے مگر کوئی خاص کامیابی نہ ہوئی۔ "بھئی ناصر میاں تم کیسے انجینئر بن رہے ہو کہ ایک ذرا سی گاڑی کے سامنے بے بس ہو" ڈاکٹر انکل نے اپنی کھانسی روکنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"مگر انکل' بھائی جان تو کمپیوٹر کے انجینئر بن رہے ہیں' گاڑیوں کے نہیں" ناصر بھائی کی جگہ میں ان کی حمایت کرتے ہوئے بولی۔ اس سے پہلے کہ ڈاکٹر انکل میری بات کی تائید یا تردید میں کچھ کہتے وہ بری طرح کھانسنے لگے۔

میں اور عمر ابھی تک دیوار پر چڑھے ڈاکٹر صاحب کو کھانسی سے بے قابو ہوتا دیکھ رہے تھے۔ جب کہ ناصر بھائی ان کے لیے پانی لینے اندر کو بھاگے۔ ناصر بھائی پانی لے کر آئے تو ڈاکٹر انکل نے جیب سے کوئی دوا نکال کر کھائی۔

"انکل! آپ کا روزہ نہیں ہے؟" عمر صاحب نے اپنا پسندیدہ موضوع چھیڑتے ہوئے نہایت تشویش سے پوچھا۔

"روزہ کیسے رکھوں بیٹا؟ مجھے تو دائمی کھانسی ہے" انہوں نے ہانپتے ہوئے جواب دیا۔

میری نظریں فوراً عمر سے ملیں۔ اس کے ذہن میں یقیناً میرا سوال ہی ابھرا تھا۔ یعنی یہ کیسے ڈاکٹر ہیں جو ذرا سی کھانسی کے آگے بے بس ہیں؟ لیکن ناصر بھائی کی آواز نے

سہلاتے ہوئے بولیں۔
"امی! امی کوئی ہمارے سب پھول چرا کر لے گیا ہے" عمر نے ہانپتے ہوئے بتایا۔
"ارے نہیں بھائی' پھول کسی نے نہیں چرائے۔ وہ تو میں نے ایک خاص شربت تیار کرنے کے لیے اتارے ہیں"۔ عمر کی بات سن کر ناصر بھائی بہت اطمینان سے بولے۔ اسی لمحے افطاری ہو گئی اور ناصر بھائی ابو اور چچا جان کے کسی بھی قسم کے رد عمل سے بچ گئے۔

ہمیں اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ "دائمی کھانسی کے لیے میرے پاس ایک بہت خوش ذائقہ شربت کا نسخہ ہے۔ یہ پھولوں سے تیار کیا جاتا ہے اور بہت فائدہ مند ہوتا ہے۔ ویسے اس کے علاوہ آپ اگر..." بھائی صاحب نے ڈاکٹر انکل کو کھانسی دور کرنے کے مزید چار پانچ علاج کھڑے کھڑے بتا دیئے۔
"صاحب زادے! کیا کمپیوٹر انجینئرنگ میں طب کا مضمون بھی پڑھاتے ہیں؟" ناصر بھائی کی باتیں سن کر ڈاکٹر انکل نے مزاحیہ انداز میں پوچھا۔
"جی نہیں' بس یہ تو میرا اپنا ہی شوق ہے" بھائی صاحب نے عاجزی سے دہرے ہوتے ہوئے جواب دیا۔
اسی شام افطاری سے کچھ دیر پہلے عمر بوکھلایا ہوا سرپٹ بھاگتا اندر آیا اور سیدھا ابراہیم سے ٹکرایا۔ ابراہیم بے چارا پہلے تو لٹو کی طرح گھوم گیا اور پھر بڑی آرام کرسی سے ٹکرا گیا۔ اس کے ماتھے پر چوٹ لگی اور وہ بھائیں' بھائیں کرکے رونے لگا۔
"اوہو' عمر! کیا آفت ہے؟" چچی جان ابراہیم کا ماتھا

"مگر بھائی جان! مجھے تو عید کے روز اپنی ٹیچر کے گھر گل دستہ لے کر جانا تھا" افطاری کے دوران میں عمر کو اچانک یاد آیا۔
"ارے عمر' میں تمھیں ان پھولوں سے' آپ کی ٹیچر کے لیے ایسا لذیذ اور فرحت بخش شربت بنا کر دوں گا کہ وہ اش اش کر اٹھیں گی!" ناصر بھائی نے بہت پرجوش انداز میں عمر کو مطمئن کرنا چاہا۔
"رہنے دیں' آپ کا بنایا ہوا شربت لے کر جاؤں گا تو ٹیچر مجھے فیل کر دیں گی" عمر نے اپنی بھرپور خفگی کا اظہار کیا۔
"عمر!" اس کی بات سن کر چچی جان نے اسے سرزنش کے انداز میں پکارا۔
"ایک تو ہمیں روزہ نہیں رکھنے دیتے اور پھر سارے پھول بھی اتار لیے ہیں" عمر نے میرے کان میں بڑبڑاتے ہوئے نجانے کس سے شکوہ کیا۔
عمر اور میں ہر روز ہی باقی گھر والوں کے ساتھ سحری کے وقت اٹھتے کہ آج ہم پورا روزہ رکھیں گے۔ لیکن ہر

روز ہی دوپہر کے کھانے کے وقت ہماری افطاری کرا دی جاتی۔ آج انیسواں روزہ تھا۔ دوپہر کے وقت کھانے کی میز پر بیٹھتے ہی عمر نے روز کی طرح احتجاج شروع کیا۔ "امی بس کل سے میں پورا روزہ رکھوں گا۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے" وہ مکا ہوا میں لہرا کر بولا۔

"دیکھو عمر' تم دونوں اس جمعے کو پورا روزہ رکھ لینا" چچی جان نے کہا۔

"جمعے کو کیوں؟ کل کیوں نہیں؟" عمر کے ساتھ ساتھ میں بھی بول پڑی۔

"وہ اس لیے کہ جمعے کے روز آپ کو اسکول سے جلدی چھٹی ہو جاتی ہے" چچی جان نے کہا۔

"اور ویسے بھی یہ تو رمضان کا آخری جمعہ ہے' اس دن روزہ رکھنے کا بہت ثواب ہوتا ہے" امی نے عمر کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"مگر تائی جان! اگلی دفعہ میں سارے روزے پورے رکھوں گا" عمر اپنا موڈ ٹھیک کرتے ہوئے بولا۔

"چلو ٹھیک ہے' اگلے سال جب آپ دونوں تیسری جماعت میں جائیں گے تو رکھ لینا پورے روزے' چچی جان نے پیار سے کہا تو ہم دونوں آنے والے رمضان کے خیال سے ہی خوش ہو گئے۔

اسی لمحے باورچی خانے میں سے کوئی مشین چلنے کی آواز آئی۔ امی نے حیرت سے چچی جان کی طرف دیکھا اور بولیں "یہ باورچی خانے میں کون ہے؟"

"ناصر بھائی ہیں' میں پانی لینے گیا تھا تو وہ پھولوں کا شربت بنا رہے تھے" عمر نے ناک سڑک کر بتایا۔

"کیا مصیبت ہے' میں دیکھتی ہوں!" امی صوفے سے اٹھتے ہوئے بے زاری سے بولیں۔ کچھ دیر بعد باورچی خانے میں سے امی کی آواز سنائی دی۔ وہ ناصر بھائی کو ڈانٹ رہی تھیں۔

اگلے روز عمر نے مجھ سے اسکول میں وعدہ لیا کہ گھر جا کر کچھ نہیں کھائیں گے تاکہ جمعے کے روزے کی کچھ مشق ہو سکے۔ لیکن اسکول سے واپسی پر نہ جانے عمر کو کیوں اتنی کھانسی آنے لگی کہ گھر پہنچتے ہی چچی جان نے اسے کھانسی کا شربت پلا دیا۔ ظاہر ہے پھر اس بے چارے کو روزہ کھولنا ہی پڑا۔ ہاں' البتہ میں کھانا کھائے بغیر ہی اسکول کا کام کرنے کے بہانے بستہ کھول کر بیٹھ گئی۔ لیکن کچھ ہی دیر بعد مجھے عجیب سی بدبو آنے لگی۔ جو چند ہی لمحوں میں اس قدر بڑھ گئی کہ مجھے متلی ہونے لگی۔ پانی پینے کے خیال سے میں جب باورچی خانے میں گئی تو ناصر بھائی وہاں پہلے سے موجود تھے اور توے پر پتا نہیں کیا چیز پکا رہے تھے' کہ جس کی بدبو خدا کی پناہ!

"یہ تم کیا کر رہے ہو؟" چچا جان بھی وہاں آپہنچے۔ وہ بھی یقیناً اس بدبو

سے بے زار ہو کر آئے تھے۔ "چچا جان' وہ میں انڈوں کی زردیوں کا تیل بنا رہا ہوں۔ یہ بال گھنے کرنے کا بہترین طریقہ ہے۔ ابراہیم کے لیے بن رہا ہے!" ناصر بھائی نے مسکرا کر کمال اطمینان سے جواب دیا۔

اب یہ بدبو اس قدر بڑھ چکی تھی کہ میں خود پر قابو نہ رکھ سکی اور مجھے ابکائی آگئی۔

میری حالت دیکھ کر چچا جان اور بھی بوکھلا گئے اور چولہا بند کرتے ہوئے بولے "بند کرو یہ فضولیات!"

"اوہو' چچا جان یہ تو ابراہیم کے ہلکے بالوں کا بہترین علاج ہے" ناصر بھائی نے پھر سے اس علاج کی اہمیت واضح کرنا چاہی۔

"رہنے دو تم اپنے یہ علاج' ایسے علاج سے تو بہتر ہے انسان اپنا سر خود منڈوا لے!" چچا جان نے کہا اور گرم ہوا باہر پھینکنے والا پنکھا چلا کر باہر چلے گئے۔

کمال ہے' کل امی کو پھولوں کی خوش بو تنگ کر رہی تھی' آج یہ محترمہ زردیوں کی بو سے بے زار ہو گئی ہیں! ہونہہ' میری حکمت کے تو سب ہی دشمن ہیں یہاں۔ چچا کے جانے کے بعد ناصر بھائی مجھے گھورتے ہوئے بڑبڑائے۔

لیکن اسی شام ابو نے ناصر بھائی کو بلا کر سختی سے کہا کہ وہ اپنی پڑھائی پر زیادہ' اور حکمت پر کم توجہ دیں' کیونکہ سبھی گھر والے ان کے اس شوق سے خاصے تنگ تھے۔

ابو کی ڈانٹ کا ناصر بھائی پر دو ایک روز تو اثر رہا مگر تیسرے ہی دن' وہ تین بڑے بڑے ناریل اٹھائے بہت پر جوش انداز میں گھر میں داخل ہوئے۔

"ناصر' یہ کہاں سے لائے ہو؟" امی نے انہیں دیکھ کر اشتیاق سے پوچھا۔

"وہ امی جان' میں نے ایک دوست سے کراچی سے منگوائے ہیں" ناصر بھائی نے خوشی سے پھولے نہ سماتے ہوئے بتایا۔

"کراچی سے؟ مگر کاہے کو؟" امی نے حیرت سے پوچھا۔

"میں ان سے آپ کو بال لمبے کرنے کے لیے ایک بہترین دوا بنا کر دوں گا" ناصر بھائی نے بہت محبت سے سب سے بڑا ناریل ہاتھ میں اٹھا کر اسے تولتے ہوئے بتایا۔

امی صرف اپنا ماتھا پیٹ کر رہ گئیں' جب کہ چچی جان نے کچھ دل چسپی کا اظہار کیا۔ عمر اور میں پہلے تو منہ اٹھائے انہیں دیکھتے رہے۔ پھر ان کے پیچھے چل پڑے۔ کیونکہ جمعے کی وجہ سے ہمیں اسکول سے کرنے کو کوئی کام نہ ملا تھا۔ باورچی خانے میں جا کر ناصر بھائی نے ناریل بہت احتیاط سے چولہے کے ساتھ بنے تختے پر رکھا اور چھری کی نوک سے اس میں سراخ کرنے کی ناکام کوشش کرنے لگے۔

"بھائی جان کیل اور ہتھوڑا لے لیں" عمر نے مشورہ دیا۔ وہ سیلف کے ساتھ رکھی اونچی کرسی پر گھٹنوں کے بل کھڑا تھا جب کہ میں منہ اوپر کر کے انہیں دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"بھئی بچو! تم جانتے ہو یہ ناریل کس قدر لذیز اور فائدہ مند ہوتا ہے" ہماری دل چسپی دیکھ کر ناصر بھائی نے دوستانہ انداز میں بتایا۔

"اوہو' بھائی آپ کیل سے سراخ کر لیں نا"۔ میں نے ان کی کوشش مسلسل ناکام ہوتے دیکھ کر عمر والا مشورہ دہرایا۔

"کیل! نہیں ٹھہرو کچھ اور لے کر آتا ہوں" یہ کہہ کر وہ باورچی خانے کے ساتھ بنے ہوئے فالتو سامان رکھنے والے کمرے میں چلے گئے۔

وہاں سے باہر آئے تو ان کے ہاتھ میں ایک دھار والی ریتی اور ہتھوڑا تھا۔ انہوں نے ریتی کی نوک ناریل کی آنکھ پر رکھی اور اس پر ہتھوڑا مارا۔ ساتھ ہی ان کے منہ سے چیخ نکلی اور ان کے ہاتھ سے خون کا فوارا نکل پڑا۔ ناصر بھائی لڑکھڑا کر باورچی خانے کے فرش پر گر گئے۔ میں حیران کھڑی رہی جب کہ عمر زور زور سے چیخنے لگا۔ اس کی آواز سن کر امی اور چچی دوڑی آئیں۔ دراصل ہتھوڑے کی ضرب سے ناریل ایک طرف لڑھک گیا تھا اور ریتی کی دھار

ناصر بھائی کی انگلی کے گوشت کو ہڈی سے الگ کرتی ہوئی گزر گئی تھی۔

امی اور چچی جان انہیں ہسپتال لے کر چلی گئیں۔ ان کے جانے کے بعد ہم دونوں کچھ دیر تو اس خوف ناک ناریل کو دیکھتے رہے۔ پھر اچانک عمر نے ہتھوڑا اٹھا کر وہ ناریل توڑ ڈالا۔ وہ ٹھاہ کی آواز کے ساتھ ٹوٹا اور اس میں سے پانی بہنے لگا۔

"یہ کیا کیا ہے؟" میں نے بوکھلا کر پوچھا۔

"اس نے ناصر بھائی کو چوٹ لگائی ہے" عمر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ پھر وہ باقی دونوں ناریل بھی اٹھا لایا اور ہم نے وہ بھی ہتھوڑے سے توڑ ڈالے۔ اس کام میں میں نے اس کا بھرپور ساتھ دیا۔

دن ڈھلے ناصر بھائی ہسپتال سے واپس آئے۔ ان کے ہاتھ پر بڑی سی پٹی بندھی ہوئی تھی اور ان کی رنگت درد سے پیلی ہو رہی تھی۔ وہ آتے ہی اپنے بستر پر لیٹ گئے اور گہری نیند سو گئے۔

افطاری کے وقت ہم سب چچا جان کے کہنے پر ان کے کمرے میں ہی چلے آئے۔

"لو ناصر دودھ پی لو" چچی جان ان کے پاس بیٹھتے ہوئے محبت سے بولیں۔

"ویسے ناصر، تمہاری حکمت میں کوئی ایسا نسخہ بھی ہو گا جس سے زخم جلد بھر جاتے ہوں" چچا جان ان کی ڈھارس بندھاتے ہوئے بولے۔

"ہائے، ہائے پتا نہیں میری توبہ!" ناصر بھائی نے درد کی شدت اور تکلیف سے ہونٹ دبائے۔

"ارے نہیں یار! گرتے ہیں شہسوار ہی میدان جنگ میں" ابو نے ناصر بھائی کا کندھا تھپ تھپاتے ہوئے محبت سے کہا۔

"نہیں ابو دیکھ لیا میدان بھی اور کر لی شہسواری بھی!" ناصر بھائی کراہ کر بولے۔

"بالکل، بھائی جان، ہم نے وہ سارے ناریل ہتھوڑے سے توڑ دیے ہیں" عمر صاحب نے اپنی کارروائی کا اعلان فرمایا۔

"ہائیں! تو کیا توڑ کر کہیں پھینک دیے ہیں؟" چچی جان نے حیرت سے پوچھا۔

"پھینکے تو نہیں وہ تو ہم نے سارے اسی وقت کھا لیے تھے" عمر اور میں نے جھٹ سے اکٹھے جواب دیا مگر فوراً ہی ہم دونوں نے اپنے سر پیٹ لیے۔ کیوں کہ آج ہی تو میں نے اور عمر نے پہلی مرتبہ پورا روزہ رکھا تھا۔

شرارتی لکیریں

شاہد ریاض شاہد

عید مبارک

فاروق حسن چانڈیو

"نثار بیٹے' اسکول سے واپس آنے کے بعد قریبی گاؤں جا کر اپنی خالہ سے سویاں بنانے والی مشین لا کر دینا۔ تاکہ میں عید کے لئے سویاں بنا لوں" نثار کی امی نے کہا۔

نثار کو اس وقت تو کوئی بہانہ نہیں سوجھا تھا۔ اس لئے حامی بھرلی تھی مگر اسکول سے واپس آنے کے بعد اس نے کہا "امی جان آج ماسٹر صاحب نے ہوم ورک بہت زیادہ دیا ہے۔ اس لئے میں خالہ کے گھر سویوں والی مشین لینے نہیں جا سکتا۔ کل لے آؤں گا۔ ویسے بھی عید آنے میں ابھی پانچ چھ دن باقی ہیں"۔

اس کی امی نے اس کی بات پر اعتبار کر لیا اور چپ ہو گئیں۔ دوسرے دن اسکول میں نثار نے پڑھائی سے دھیان ہٹا کر پھر سے نیا بہانہ سوچنا شروع کیا۔ اس نے پہلے تو سوچا کہ سر درد کا بہانہ کروں۔ مگر خود ہی اس بہانے کو رد کر دیا۔ کیوں کہ اسے معلوم تھا کہ امی جان کے پاس سر درد کے علاج کے لئے بہت ہی کڑوی دوائی موجود ہے۔ جو انہوں نے حکیم صاحب سے لی ہوئی ہے۔ دراصل اس کی امی کے سر میں اکثر درد رہتا تھا۔ اس بہانے کو رد کرنے کے بعد اس نے دوسرا بہانہ تلاش کرنا شروع کیا۔ کافی دیر سوچنے کے بعد آخرکار اس نے ایک جھوٹی کہانی گھڑ لی اور گھر پہنچ کر والدہ سے کہا "امی جان' آج اسکول کے پاس خالہ زاد بھائی ثناء اللہ سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس نے بتایا ہے کہ ان کی ایک پڑوسن آج ہی ایک دن کے لئے سویاں بنانے والی مشین مانگ کر لے گئی ہے"۔
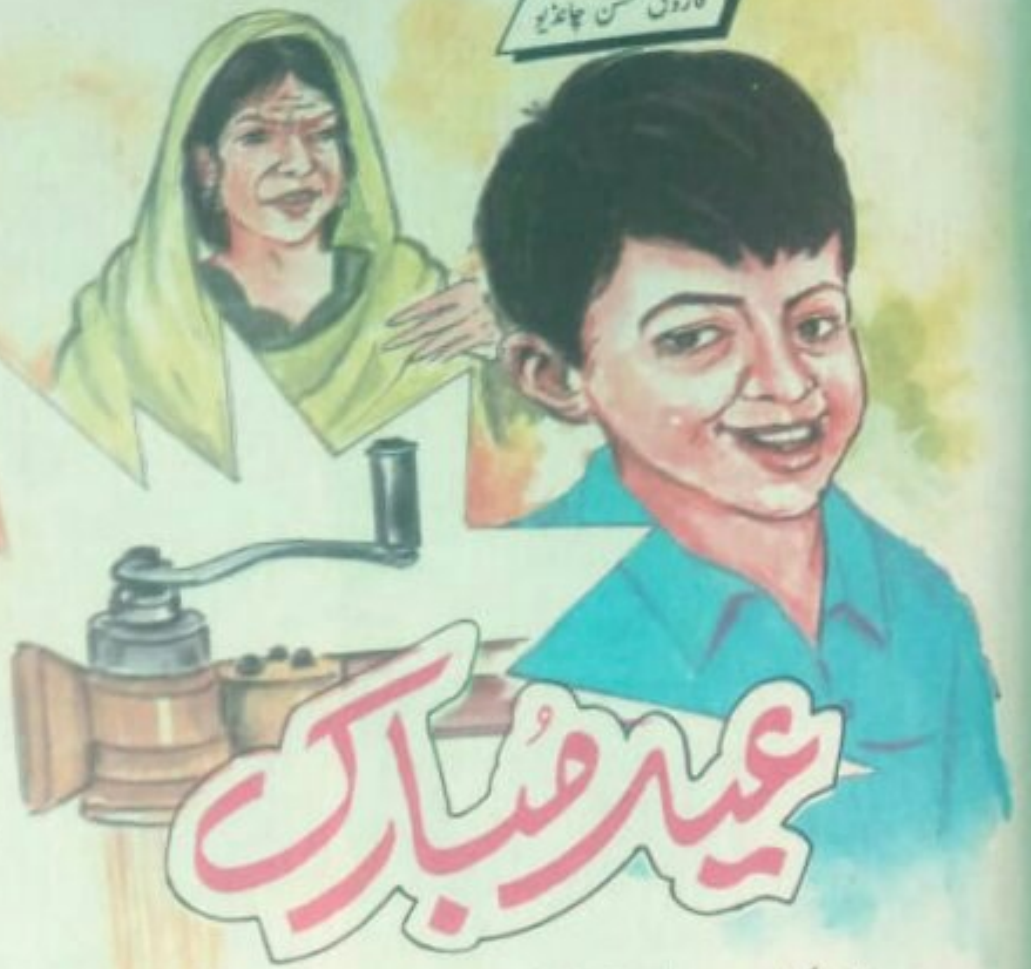
اس کی امی یہ سن کر پریشان ہو گئیں اور کہا "یہ تو بہت برا ہوا۔۔۔ عید میں اب صرف تین چار دن رہ گئے ہیں۔ کم سے کم تین دن سویاں بناؤں گی تب جا کر اتنی بن سکیں گی جو اپنی ضرورت کے لئے اور محلے کے چند گھروں میں ایک ایک پلیٹ دینے کے لئے کافی ہوں گی۔ خیر کوئی بات نہیں۔ کل ضرور مشین لے آنا پھر جلدی جلدی بنانے کی کوشش کروں گی"۔

"جی امی جان۔ آپ بے فکر رہیں کل تو ضرور مشین لے آؤں گا" نثار نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ اپنی جھوٹی کہانی کی کامیابی پر بہت خوش تھا۔

تیسرے دن نثار بہت پریشان تھا۔ کوئی نیا بہانہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا اور وہ دو میل پیدل خالہ کے گھر مشین لینے جانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ سویاں ویسے بھی اس کو اچھی نہیں لگتی تھیں۔ والدہ بنئیں یا پڑوسی کھائیں یا نہ کھائیں اسے اس کی پروا نہیں تھی۔ لیکن مجبوری یہ تھی کہ بغیر کسی بہانے کے انکار کرنے پر جوتیاں پڑنے کا خطرہ تھا۔

سوچتے سوچتے چھٹی ہو گئی مگر وہ کوئی بہانہ بنانے میں

کام یاب نہ ہو سکا۔ اب وہ گھر جاتے ہوئے خود کو دو میل
پیدل خالہ کے گھر جانے اور پھر مشین کندھے پر اٹھا کے دو
میل واپس آنے کے لئے ذہنی طور پر تیار کر رہا تھا۔ ابھی وہ
گھر سے کچھ ہی دور تھا کہ اسے اپنا ایک دوست سلیم نظر آیا
جو لنگڑاتا ہوا ایک طرف جا رہا تھا۔ نثار نے پوچھا۔ "یار سلیم!
کیا بات ہے۔؟ آج لنگڑا کیوں رہے ہو؟"۔

"یار' پاؤں میں موچ آگئی ہے۔ بابا ولی سے مالش
کروانے جا رہا ہوں" سلیم نے جواب دیا۔

یہ جواب سن کر نثار کو اچانک خیال آیا کہ وہ بھی
پاؤں میں موچ آنے کا بہانہ بنا کر خالہ کے گھر جانے سے بچ
سکتا ہے۔ اب وہ بے فکر ہو کر گھر کی طرف چل پڑا۔ گھر کے
قریب پہنچ کر اس نے لنگڑانا شروع کر دیا۔ گھر کے اندر داخل
ہوتے ہی اس نے کراہنا بھی شروع کر دیا۔ اسے اس حالت
میں دیکھ کر والدہ اور بہنوں نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "کیا ہوا؟
کیوں لنگڑا رہے ہو؟۔ کیوں کراہ رہے ہو"؟۔

نثار نے شدید درد کی اداکاری کرتے ہوئے اپنا سوچا
ہوا جھوٹ سنایا۔

"اللہ خیر کرے میرے لعل! بیٹا' جا کے تم بابا ولی سے
مالش کرالو۔ ان شاء اللہ ایک دو دن میں ٹھیک ہو جاؤ گے"
اس کی امی نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

"مگر امی جان! اب سویاں بنانے والی مشین کون
لائے گا؟ ہماری تو خیر ہے مگر پڑوسیوں کو ایک ایک پلیٹ نہ
بھیجی تو وہ کیا سوچیں گے؟ یہاں شہر تو قریب ہے نہیں کہ
بنی بنائی سویاں لے لی جائیں"۔ بڑی بہن عالیہ نے پریشان ہو
کر کہا۔

"اب نثار تو اس حال میں جانے سے رہا" والدہ
نے اتنا بول کر سوچنا شروع کیا۔ پھر کچھ دیر بعد کہا "اب تو
ہم ماں بیٹی کو ہی جانا پڑے گا"!

نثار اپنی امی کی یہ بات سن کر دل ہی دل میں بہت
خوش ہوا مگر ظاہر میں کراہتے ہوئے کہنے لگا۔ "اچھا امی جان!
میں بابا ولی سے مالش کروانے جا رہا ہوں"۔

وہ لنگڑاتا ہوا اوپر اوپر سے منہ کو کرب ناک بنائے مگر
اندر سے خوش خوش گھر سے نکلا۔ اسے بابا ولی کی طرف
جانے کے لئے میدان پار کر کے جانا تھا۔ مالش تو خیر اس نے
کروانی نہیں تھی مگر والدہ کو دکھانے کے لئے جانا اسی طرف
ہی تھا۔ ابھی اس نے آدھا میدان ہی پار کیا تھا کہ اسے گردباد
(چکر کھاتی ہوئی ہوا) نظر آیا۔ وہ دھول سے بچنے کے لئے
رک گیا تاکہ گردباد گذر جائے۔ جب گردباد اس کے قریب
سے گذرنے لگا تو اسے اس میں اڑتا ہوا ایک کرنسی نوٹ
نظر آیا۔ اس کے خیال میں یہ پانچ سو یا ہزار کا نوٹ تھا۔
اڑتی ہوئی مٹی کے درمیان ہونے کی وجہ سے وہ ٹھیک سے
پہچان نہیں پا رہا تھا۔ اس نے پیچھے مڑ کر گھر کی طرف دیکھا
کہ کوئی اسے دیکھ تو نہیں رہا۔ گھر کا دروازہ بند پا کر وہ خوش
ہو گیا اور گردباد کی طرف لپک پڑا۔

نوٹ بہت اونچا اڑ رہا تھا۔ وہ گردباد کے ساتھ ساتھ
آگے بڑھتا رہا تاکہ نوٹ جب چکر کھا کر نیچے آئے تو وہ لپک
کر پکڑ لے۔ اس کی آنکھوں میں مٹی پڑ رہی تھی مگر وہ
زبردستی آنکھیں کھولے نوٹ پر نظر جمائے ہوئے تھا۔ نوٹ
کبھی چکر کھا کر نیچے آ جاتا کبھی پھر اوپر چلا جاتا۔ مگر اتنا نیچے
نہیں آتا تھا کہ وہ لپک کر اسے پکڑ سکے۔

اب تو اس کی آنکھوں میں مٹی کے ساتھ تنکے
بھی پڑ رہے تھے۔ اسے اپنی آنکھوں میں شدید جلن محسوس
ہو رہی تھی۔ اس لئے انہیں کھولے رکھنا بہت ہی مشکل ہو
رہا تھا مگر وہ پوری قوت سے آنکھیں کھولے ہوئے تھا اور
گردباد کے ساتھ آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ اچانک اس کو زور
دار جھٹکا لگا اور دھڑام سے نیچے گڑھے میں گر پڑا۔ نظر نوٹ
کی طرف ہونے کی وجہ سے راہ میں آنے والا گڑھا اسے
نظر نہیں آیا تھا۔ اسے بہت سی چوٹیں لگیں تھیں۔ کچھ دیر
تک تو اٹھ کر گردباد کے پیچھے جانے کی اس میں ہمت نہیں
ہو رہی تھی۔ مگر پھر نوٹ کی کشش نے اسے اتنی قوت بخش
دی کہ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ درد کی ٹیسوں کی پروا کئے بغیر وہ ایک
بار پھر گردباد کی طرف دوڑ پڑا۔ اور کچھ ہی دیر میں اس تک

پہنچ گیا۔

تھوڑی سی تلاش کے بعد اسے نوٹ بھی اڑتا ہوا نظر آیا۔ کچھ دیر بعد ہوا کا چکر اچانک نوٹ کو نیچے لے آیا۔ نثار نے چھلانگ لگا کر اسے پکڑ تو لیا مگر بری طرح منہ کے بل نیچے جا گرا۔ وہ اتنی زور سے گرا تھا کہ اس کی پیشانی پر گومڑہ سا بن گیا۔ اس کا ہونٹ بھی پھٹ گیا تھا۔ مگر نوٹ مل جانے کی خوشی میں اسے درد نہیں محسوس ہو رہا تھا۔ البتہ اب آنکھوں کو مزید کھولے رکھنا اس کے بس میں نہیں رہا تھا۔ وہ ایک ہاتھ میں نوٹ کو دبائے ہوئے تھا اور دوسرے سے آنکھوں کو مل رہا تھا۔ تاکہ جلن کچھ کم ہو تو وہ نوٹ کو اچھی طرح سے دیکھ سکے۔ اور جان سکے کہ وہ پانچ سو کا نوٹ ہے یا ہزار کا۔ کافی دیر ملنے کے بعد آخر وہ آنکھیں کھولنے میں کامیاب ہوا۔ اس نے دامن سے آنسو صاف کیے اور نوٹ کو دیکھا۔

نوٹ دیکھتے ہی اس کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ یہ ایک ہزار کا کھلونا نوٹ تھا۔ جس پر لکھا ہوا تھا "عید مبارک" یہ الفاظ عام حالات میں تو بہت بھلے لگتے ہیں لیکن اس وقت وہ الفاظ نثار کو انتہائی برے لگ رہے تھے۔ ساتھ ہی اب اسے درد کی شدید ٹیسیں بھی محسوس ہونے لگیں۔ کافی دیر تک وہ وہیں بیٹھا ہانپتا اور کراہتا رہا۔ آخرکار اس نے گھر جانے کا سوچا۔ وہ کسی طرح اٹھ تو گیا مگر جب قدم اٹھایا تو پاؤں میں شدید درد کی ٹیسیں اٹھیں۔ اسے معلوم ہوا کہ پاؤں میں موچ آگئی ہے۔ احساس ہوتے ہی اسے وہ جھوٹ یاد آگئے جو وہ اکثر اپنی والدہ سے بولتا تھا۔ اب اس کو خیال آیا کہ اسے یہ سزا اللہ نے والدہ سے جھوٹ بولنے کی وجہ سے دی ہے۔ وہ بہت شرمندہ ہوا۔ اس نے دل میں پکا ارادہ کیا کہ آئندہ کسی سے بھی جھوٹ نہیں بولے گا اور والدہ جو بھی کام کہیں گی وہ فوراً کرے گا۔ اس مثبت سوچ کے ساتھ وہ گھر کی طرف چل پڑا۔ اس سے چلا نہیں جا رہا تھا۔ مگر کسی نہ کسی طرح لنگڑاتا ہوا گھر پہنچ گیا۔ اس کی والدہ اس وقت خالہ کی طرف جا چکی تھیں۔ جب وہ واپس آئیں تو نثار نے پاؤں پکڑ کر ان سے معافی مانگی اور اپنی حالت دکھا کر کہا کہ میں نے آپ سے موچ آنے کا جھوٹ بولا تھا۔ اللہ نے مجھے سزا کے طور پر موچ کے ساتھ اور بھی بہت سی چوٹیں دی ہیں۔ میں نے اللہ سے گناہوں پر معافی مانگ لی ہے۔ امی جان آپ بھی مجھے معاف کر دیں"۔

"میرے پیارے اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تمہاری آنکھیں جلد کھل گئی ہیں اور تم راہ راست پر آگئے ہو" امی نے اسے گلے لگاتے ہوئے کہا۔

☆ ☆ ☆

کارٹون کہانی

شاہد ریاض شاہد

ملا نصرالدین نے بسنت منائی

سرجن ہارڈی نے صبح کا اخبار اٹھایا تو ان کی نظر پہلے صفحے پر چھپے ہوئے اشتہار پر پڑی۔ لکھا تھا۔ "ہر عمر کے انسانوں کے لیے اصلی دل، جگر، گردے، پھیپھڑے اور دوسرے اعضا مناسب قیمت پر مہیا کئے جاتے ہیں۔ انسانی جسم کے ریشوں سے اگائے ہوئے یہ اعضا مناسب قیمت پر مہیا کئے جاتے ہیں۔ انسانی جسم کے ریشوں سے اگائے ہوئے ان اعضا کو محکمہ صحت کی منظوری حاصل ہے اور ملک کے بڑے طبی ادارے ان کی بہترین کارکردگی کی تعریف کر رہے ہیں۔ ضرورت مند لوگ فوری طور پر ولسن آرگن فارم سے رابطہ کریں"۔

سرجن ہارڈی نے ابھی تک جتنے بھی اعضا تبدیل کئے وہ مرتے ہوئے انسانوں کے جسم سے حاصل کئے گئے تھے۔ اس میں مشکل یہ تھی کہ اکثر مریضوں کو فوری طور پر جسم کے کسی عضو کی تبدیلی کی ضرورت ہوتی تھی اور اگر یہ نہ ملتا تو مریض کو جان سے ہاتھ دھونا پڑتا تھے۔ سرجن ہارڈی اس نئی تحقیق سے بے خبر نہیں تھے۔ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ اکیسویں صدی کے شروع میں ہی نئے پیدا ہونے والے بچوں کے جسم سے ریشے حاصل کر کے تجربہ گاہوں میں انسانی اعضا اگانے کی کوشش کام یاب ہو گئی تھی۔ یہ ریشے بیج کا کام دیتے تھے اور ان سے سائنس دان پورے پورے عضو تیار کر لیتے تھے۔ تاہم یہ پہلا موقعہ تھا کہ ان اصلی اعضا کا اشتہار انہوں نے اخبار میں دیکھا تھا۔

سرجن ہارڈی نے اشتہار میں دیئے ہوئے فون نمبر پر ولسن آرگن فارم سے رابطہ کیا۔ ادھر سے آواز آئی "ہم آپ کی کیا خدمت کر سکتے ہیں؟"

سرجن نے جواب دیا "آج کے اخبار میں آپ کا اشتہار دیکھا۔ میں اس سلسلے میں کچھ اور باتیں معلوم کرنا چاہتا ہوں"۔

آپریٹر نے کہا "ہولڈ کیجئے۔ میں آپ کی بات سیلز ڈائریکٹر سے کراتی ہوں"۔ اور فوراً ہی وڈیو ٹیلی فون پر سیلز ڈائریکٹر کی تصویر آگئی۔ اس نے بڑی گرم جوشی سے کہا "کہئے سرجن ہارڈی کیسے مزاج ہیں آپ کے؟"

سرجن نے ذرا تعجب سے سوال کیا "آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ میں سرجن ہارڈی ہوں؟"

ڈائریکٹر نے ہنستے ہوئے کہا "جناب آپ کی تصویر میرے سامنے ہے۔ اگر آپ جیسے ماہر سرجن کو نہ پہچانیں تو پھر یہ کاروبار کس طرح کریں گے"۔

سرجن ہارڈی نے مسکراتے ہوئے کہا "شکریہ، شکریہ، اچھا یہ جو آپ کا اشتہار ہے اس کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہتا ہوں"۔

ڈائریکٹر نے جلدی سے کہا "سرجن ہارڈی! کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ آپ تھوڑا سا وقت نکال کر ہماری تجربہ گاہ تشریف لے آئیں۔ آپ ہر چیز دیکھ بھی لیں گے اور آپ سے باتیں بھی ہو جائیں گی۔ ہم آپ کا انتظار کریں گے۔ ضرور آیئے"۔

تھوڑی ہی دیر بعد سرجن ہارڈی کی فلائنگ کار ولسن آرگن فارم کے احاطہ میں اتری۔ سکریٹری نے ان کا

استقبال کیا اور فوراً انہیں سیلز ڈائریکٹر کے کمرے میں لے گئی۔ ڈائریکٹر نے سرجن کو خوش آمدید کہا "آپ نے یہاں آکر ہماری عزت بڑھا دی۔ یہ بتایئے کہ آپ ہمیں کتنا وقت دے سکتے ہیں؟"

"آدھا گھنٹا" سرجن نے کمرے میں لگے ہوئے پوسٹروں پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ تو پہلے میں آپ کو تجربہ گاہ میں لے چلتا ہوں اور پھر ایک پیالی کافی"۔ ڈائریکٹر یہ کہتے ہوئے اٹھا اور سرجن ہارڈی کو ساتھ لے کر کمرے سے باہر چلا گیا۔

سرجن ہارڈی تجربہ گاہ میں پہنچا تو حیران رہ گیا۔ وہ نشوونما ریشہ سے انسانی اعضا کی تیاری کے بارے میں خبریں اور مضمون بڑی دل چسپی سے پڑھتا رہا تھا لیکن اسے یہ اندازہ نہ تھا کہ سائنس دان جسم کا ہر عضو اصلی حالت میں اتنی جلدی اور اتنی کامیابی سے اگالیں گے۔ سیلز ڈائریکٹر نے سرجن کو بتایا کہ یہ تحقیق امریکا، برطانیہ اور جاپان میں بیسویں صدی کے آخری چند برسوں میں شروع ہوئی۔ پہلے جاپان میں بکری کے بچے پر یہ تجربہ کیا گیا۔ اس کے بعد یہ سلسلہ آگے بڑھا اور انسان پر تجربے ہونے لگے۔ ساری دنیا میں شور مچ گیا۔ کوئی کہتا تھا یہ طریقہ غلط ہے کہ ایک چھوٹے سے بچہ کے جسم سے ریشے نکال کر اس سے اعضا اگائے جائیں۔ ان لوگوں کے خیال میں بے زبان بچے کو تکلیف بھی ہوتی ہوگی اور یہ انسان کی توہین بھی ہے۔ لیکن دوسری طرف لوگوں کا یہ کہنا تھا کہ اس طریقے سے ریشے حاصل کرنے میں بچے کو کوئی تکلیف نہیں ہوتی اور یہ کام بیمار انسانوں کی بھلائی کے لیے ہے۔ پھر ریشے والدین کی رضا مندی سے ہی تو نکالے جاتے ہیں۔

یہ بحث اپنی جگہ چلتی رہی اور تحقیق اپنی جگہ جاری رہی۔ آخر کار سائنس دانوں کو کامیابی ہوئی۔ نہ صرف انسانی اعضا تیار ہو گئے بلکہ انہیں مریض کے جسم میں لگانے کے لیے رگیں اور شریانیں بھی اگائی گئیں۔ سیلز ڈائریکٹر سرجن ہارڈی کو دل، جگر اور دوسرے اعضا دکھاتا جاتا تھا اور بتاتا جاتا تھا "دیکھیے یہ دل کی تبدیلی کا مکمل سیٹ ہے۔ میرا مطلب ہے شریانوں کے ساتھ، ہم دل اور شریانیں علیحدہ علیحدہ بھی فروخت کرتے ہیں۔ یہ گردے ہیں۔ اگر ایک گردہ لیا جائے تو مہنگا پڑے گا لیکن سیٹ خریدا جائے تو خاصی رعایت ہو گی۔ اور ہسپتالوں سے تو ہم خاص رعایت کرتے ہیں۔ دراصل ہم تو انسانیت کی خدمت کے جذبے سے کام کر رہے ہیں"۔

"انسانیت کی خدمت کا جذبہ" سرجن ہارڈی نے طنزیہ یہ جملہ دہرایا اور سوچنے لگا کہ کیا اب انسانی اعضا کی بھی تجارت ہوا کرے گی؟ انسان کے دل گردے اور پھیپھڑے اسی طرح بازار میں فروخت ہوں گے جس طرح آج قصائی کی دکان پر جانوروں کے کلیجی گردے بکتے ہیں۔ سرجن ہارڈی نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ اسے چکر آنے لگا۔ اور بے اختیار اس کی زبان سے نکلا "میرے خدایا یہ کیسی ترقی ہے؟"

سیلز ڈائریکٹر نے سرجن ہارڈی کی یہ کیفیت دیکھی تو جلدی سے بولا "دیکھیے کتنی اچھی بات ہے کہ نہ تو مریض کو اعضا کا عطیہ دینے والوں کا انتظار کر کے اپنی جان کا خطرہ مول لینا پڑے گا اور نہ ہی کسی کا احسان اٹھانا پڑے گا۔ اور پھر اس میں یہ خطرہ بھی نہیں کہ مریض کا جسم انہیں قبول نہ کرے۔ یہ تازہ اور سو فی صد صحت مند اعضا ہوں گے"۔

"ہونہہ ٹھیک ہے" سرجن نے بڑی بے دلی سے یہ جملہ کہا اور سیلز ڈائریکٹر سے اجازت چاہی۔

راستے میں سرجن ہارڈی کو جیمس کا خیال آیا جو شہر کا رئیس تھا۔ اس کا ایک گردہ بالکل بے کار ہو چکا تھا اور دوسرا بھی کام چھوڑ رہا تھا۔ اس کی زندگی مشینوں کے سہارے بسر ہو رہی تھی۔ سرجن ہارڈی نے اسے فون کیا اور وہ فوراً تجربہ گاہ میں اگائے گئے گردے خریدنے پر تیار ہو گیا۔ ہارڈی کا یہ تجربہ بہت کامیاب رہا اور ریڈیو، ٹیلی وژن اور اخباروں میں اس کی خوب شہرت ہوئی۔ اس کے بعد سرجن ہارڈی نے بہت سے آپریشن کیے اور بے شمار اعضا

تبدیل کیے۔ وقت گزرتا گیا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اصلی اعضا کی تیاری اور اعضا کی تبدیلی ایک عام بات ہو گئی۔ اب بہت سی کمپنیاں انسانی اعضا کا کاروبار کر رہی تھیں۔ آپس کے مقابلہ کی وجہ سے ان کی قیمتوں میں بھی کافی کمی ہو گئی تھی۔ لیکن اب بھی یہ قیمتیں ایک عام انسان کی پہنچ سے باہر تھیں۔ سائنس دان سائمن ان لوگوں میں شامل تھا جن کو ڈاکٹروں نے فوری طور پر دل کی تبدیلی کا مشورہ دیا تھا۔ وہ کافی دن سے سرجن ہار ڈی کے کلینک کے چکر کاٹ رہا تھا لیکن مشکل یہ تھی کہ اس نے اپنے علاج کے لیے جو انشورنس کرائی تھی اس میں اتنی گنجائش نہیں تھی کہ اس کے دل کی جگہ ریشوں سے اگایا ہوا اصلی دل لگایا جا سکے اور خود اس کے پاس اتنی رقم نہیں تھی کہ وہ نیا دل خرید سکے۔ سرجن ہار ڈی کو سائمن سے بڑی ہمدردی تھی کیوں کہ ایک تو وہ بالکل جوان تھا اور دوسرے یہ کہ وہ بے حد ہونہار اور ذہین انسان تھا۔ جو مستقبل میں اپنے وطن کے لیے بڑے اچھے اچھے کام کر سکتا تھا۔ سرجن نے طے کر لیا تھا کہ وہ ہر قیمت پر سائمن کا دل بدلے گا۔ یعنی اس کے بیمار دل کی جگہ انسانی ریشوں سے تیار کیا ہوا تازہ اور صحت مند دل لگائے گا۔ سرجن ہار ڈی کو یہ بھی اندازہ تھا کہ یہ کام جلد ہونا چاہیے کیوں کہ سائمن کا دل کسی وقت بھی اپنا کام چھوڑ سکتا ہے۔

سرجن ہار ڈی یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ وہ اس آپریشن کے لیے نہ اپنی فیس لے گا اور نہ اسپتال کے اخراجات۔ خوش قسمتی سے اس کی سفارش پر ایک ادارہ نئے دل کی قیمت ادا کرنے پر بھی راضی ہو گیا۔ لیکن اس ادارے نے سرجن ہار ڈی کو تاکید کی کہ وہ مارکیٹ کا جائزہ لے کر کم سے کم قیمت میں یہ دل حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ سرجن نے اپنے کمپیوٹر پر انسانی اعضا کے فارموں کی تفصیل دیکھنا شروع کی۔ ان سب میں ایور گرین آرگن فارم کے ریٹ انھیں بہت مناسب لگے۔ لہٰذا انھوں نے اسی ادارے کو آرڈر دے دیا۔

سائمن کا آپریشن بہت کام یاب رہا۔ سرجن ہار ڈی کو بے حد خوشی تھی کہ انھوں نے ایک ایسی جان بچالی جو وطن کے لیے بہت قیمتی تھی۔ سائمن کو ایک طرح سے نئی زندگی مل گئی۔ وہ ہار ڈی کا بہت شکر گزار تھا اور اکثر اس سے ملنے آتا تھا۔ چھ ساتھ مہینے تو خیریت سے گزر گئے لیکن پھر اچانک سائمن کے دل میں تکلیف شروع ہو گئی۔ سرجن ہار ڈی سخت پریشان تھا کہ ایسا کیوں ہوا۔ آپریشن میں بڑی احتیاط سے کام لیا گیا تھا اور یہ سو فی صد کام یاب ہوا تھا۔ پھر وہ سوچنے لگا کہ کہیں اس کی کسی غلطی سے تو ایسا نہیں ہوا۔ وہ دل ہی دل میں اپنے کو الزام دینے لگا۔

سائمن کی حالت بگڑتی گئی اور اسے اسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ سرجن ہار ڈی اور دوسرے ڈاکٹر اس کی جان بچانے کی پوری کوشش کر رہے تھے۔ جو ٹسٹ کیے گئے ان کے بعد سرجن ہار ڈی نے ایک رائے قائم کر لی۔ انھیں یقین تھا کہ وہ اس خرابی کا کھوج لگانے میں کام یاب ہو چکے ہیں۔ لیکن انھوں نے کسی سے کوئی بات نہ کی اور سائمن کا علاج کرتے رہے۔ چند ہی روز گزرے تھے کہ سرجن ہار ڈی کی رائے کی تصدیق ہو گئی۔ اخباروں میں بڑی بڑی سرخی کے ساتھ یہ خبر چھپی ہوئی تھی۔

"انسانی اعضا کے سوداگر انسان کی جان سے کھیل رہے ہیں۔ دو نمبر مال بننا شروع ہو گیا۔ انسانی جسم کے ریشوں میں بھی ملاوٹ شروع ہو گئی۔ انسانی ذہن کا کمال"۔

سرجن ہار ڈی ابھی پوری خبر نہ پڑھ پائے تھے کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ادھر سے آواز آئی "سرجن ہار ڈی! ہمیں افسوس ہے کہ سائمن کو نہ بچایا جا سکا"۔

ہار ڈی نے فون بند کر دیا اور سر ہاتھوں میں پکڑ کر سوچنے لگا "انسانی ذہن کا کمال خود انسان پر کیا کیا غضب ڈھائے گا؟ کتنی قیمتی جانیں دولت کی ہوس کی بھینٹ چڑھیں گی؟ انسان نے سائنس کے میدان میں اتنی بڑی کام یابی حاصل کی اور اب خود اس کامیابی پر پانی پھیر رہا ہے۔ میرے خدا کیا دولت کی یہ ہوس کبھی ختم نہ ہو گی؟"

کرکٹ کے جلاد

سری لنکا کی ایک روزہ کرکٹ کی عالمی چمپئن کرکٹ ٹیم آج کل عالمی کرکٹ میں زبردست کامیابیاں حاصل کر رہی ہے۔ ایک وقت تھا کہ سری لنکا کی ٹیم کو "بے بی" ٹیم کہا جاتا تھا اور غیر ملکی ٹیمیں سری لنکا آکر باآسانی فتح حاصل کرتی تھیں اور سری لنکا کی ٹیم غیر ملکی دوروں پر ناکامی کے داغ سمیٹتی تھی۔ پھر ایک وہ دور بھی آیا کہ سری لنکا نے پچھلے عالمی کپ میں یادگار فتح حاصل کی اور دنیا کی نمبرون ٹیم بن گئی۔

چند سال پہلے کسی نے سری لنکا کے جنوبی صوبے کے ایک قصبے ماترا میں رہنے والے ایک نوجوان کرکٹر سے پوچھا کہ تمہارا خواب کیا ہے؟ اس نے جواب دیا "سری لنکا کے لیے کھیلنا"

اگرچہ کرکٹ کھیلنے والا ہر نوجوان اپنے ملک کی نمائندگی کے خواب دیکھتا ہے مگر چند ہی اس خواب کو اپنی محنت اور عمدہ کارکردگی سے حقیقت میں بدلنے میں کام یاب ہوتے ہیں۔ جیا سوریا بھی وہ خوش قسمت کھلاڑی ہے جس نے اپنے خواب کی تعبیر پائی ہے۔ جیا سوریا نے اپنی کارکردگی سے سری لنکا کی ٹیم کو وہ کامیابیاں دلائیں جنھیں یقیناً ناقابل فراموش کہا جاسکتا ہے۔

کرکٹ کی دنیا عظیم اور متاثر کن بلے بازوں سے بھری پڑی ہے لیکن کچھ ایسے نام بھی ہیں جو ناقابل فراموش کہے جاسکتے ہیں۔ جب بھی اور جہاں بھی ریکارڈ ساز بلے بازوں کا ذکر آئے گا وہاں جیا سوریا کے نام کے بغیر بات مکمل نہیں ہوگی۔ جیا سوریا نے آج کل اپنی غیر معمولی کارکردگی سے اپنے ہم عمر کھلاڑیوں کو فکر مند کر رکھا ہے۔ یکے بعد دیگرے بڑی اننگز کھیل کر اس نے تمام عظیم کھلاڑیوں کو مات دے دی ہے۔

سنتھ تیران جیا سوریا نے 30 جون 1969ء کو سری لنکا کے جنوبی صوبے کے ایک قصبے ماترا کے قریب ایک مچھیروں کی بستی میں جنم لیا۔ سری لنکا کے دارالحکومت کولمبو سے سو میل کے فاصلے پر چھوٹا سا یہ قصبہ مچھلیوں کے شکار کے لیے شہرت رکھتا ہے۔ جیا سوریا کا بڑا بھائی چندنا اسی کاروبار سے منسلک ہے جب کہ اس کے والد قصبے کی کونسل کے سینیٹری سپروائزر کی حیثیت سے کام کرتے ہیں۔

جیا سوریا نے نو برس کی عمر میں کرکٹ میں دل چسپی لینی شروع کردی۔ روز بروز وہ کرکٹ کے شوق میں مگن ہوتا چلا گیا۔ پھر اس نے اپنے اسکول کی طرف سے کھیلنا شروع کر دیا اور جلد ہی وہ اسکول کی کرکٹ ٹیم کا کپتان بن گیا۔ جیا سوریا اپنی اسکول ٹیم کی طرف سے بائیں ہاتھ سے پر لطف بیٹنگ کے علاوہ اسپن آف بریک باؤلنگ بھی کیا کرتا تھا۔ جیا سوریا نے ابتدا ہی سے عمدہ کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ یہ کارکردگی سب کو امید دلا رہی تھی کہ جیا سوریا آنے والے دنوں میں بڑے کھلاڑیوں کی صف میں شامل ہو جائے گا۔ حالاں کہ کولمبو سے باہر اور خصوصاً اتنی دور واقع کسی علاقے سے کسی کھلاڑی کے قومی ٹیم تک پہنچنے کے امکانات بہت کم ہوتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ جیا سوریا کا بھائی صرف سترہ برس کی عمر میں کرکٹ کو خیرباد کہہ گیا لیکن جیا سوریا نے ہمت نہ ہاری اور محنت جاری رکھی۔ 1988ء میں اسے اپنی محنت کا صلہ ملا اور اسے اسکول برائے کرکٹر آف دی ایئر قرار دیا گیا اور یوں اس کے شوق میں اضافہ ہوگیا۔ اس نے جدوجہد جاری رکھی۔ یوں وہ 88-1987 میں آسٹریلیا میں میکڈونا لڈیوتھ ورلڈ کپ میں شریک ہونے والی سری لنکن ٹیم کا ایک اہم رکن بن گیا۔ اس ٹورنامنٹ میں اس نے نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔

ہائی اسکول میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد جیاسوریا کولمبو آگیا اور کولمبو کرکٹ کلب میں شمولیت اختیار کرلی۔ کولمبو آکر اس نے اپنی متاثر کن بیٹنگ سے دیکھنے والوں کو پوری طرح محظوظ کیا۔ جیاسوریا کے بلے سے نکلنے والے رنز کے سیلاب نے قومی سلیکٹرز کو بھی حیران کردیا۔ اس طرح اس نوجوان "کھبے" کو فرسٹ کلاس کرکٹ تک پہنچنے میں دیر نہ لگی۔ صرف 20 سال کی عمر میں وہ اس منزل تک پہنچ گیا۔ 89ء میں جب سری لنکا کی بی ٹیم نے پاکستان کا دورہ کیا تو جیاسوریا اس ٹیم میں شامل تھا۔ اس دورے پر اس نے اپنا پہلا فرسٹ کلاس میچ کراچی کی ٹیم کے خلاف کھیلا اور اس میں ناقابل شکست سنچری اسکور کی۔ اس دورے پر پاکستان بی کے خلاف دو لگاتار غیر سرکاری ٹسٹ میچوں میں اس نے سنچریاں اسکور کرکے سب سے خوب داد وصول کی۔

جیاسوریا نے اپنا پہلا ون ڈے انٹرنیشنل 90-1989ء میں آسٹریلیا کے خلاف ملبورن کے میدان میں کھیلا جب کہ اس نے اپنے ٹسٹ کیریئر کا آغاز ایک سال بعد 91-1990ء میں نیوزی لینڈ کے خلاف ہملٹن ٹسٹ میں کیا۔ جیاسوریا تقریباً ایک سو کے قریب ون ڈے انٹرنیشنل میچ کھیلنے کے بعد اسٹار بنا۔ وجہ یہ تھی کہ پہلے اسے چھٹے، ساتویں یا آٹھویں نمبر پر بیٹنگ کے لیے بھیجا جاتا جہاں اس کے لیے کوئی کرشمہ سازی ممکن نہیں تھی۔ البتہ جیاسوریا کی باؤلنگ پر اعتماد کیا جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ سری لنکا کی طرف سے سب سے سو وکٹیں حاصل کرنے والا باؤلر بن گیا۔

جیاسوریا کے کیریئر میں ٹرننگ پوائنٹ دراصل 1994ء میں آیا جب پاکستان کا سری لنکا کا دورہ جاری تھا۔ روشن ماہنامہ ان فٹ ہو گئے۔ اسی وجہ سے رانا ٹنگا اور ٹیم کے منیجر دلیپ مینڈس نے جیاسوریا سے اوپن کروانے کا فیصلہ کیا۔ جیاسوریا نے اس شاندار موقع سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور تین میچوں میں لگاتار نصف سنچریاں بنا کر نمبرون پوزیشن پر قبضہ جمالیا۔

سری لنکا نے 95ء کے آغاز میں نیا روپ اختیار کرکے جیاسوریا نے مرکزی کردار سنبھال لیا۔ چھٹے ورلڈ کپ میں اس کی غیر معمولی کارکردگی نے سری لنکا کو ورلڈ چیمپین بنوا دیا۔ اس کو عالمی کپ کے بہترین کھلاڑی کا اعزاز دیا گیا۔ ورلڈ کپ کے فوراً بعد سنگاپور میں سنگر کپ کا انعقاد کیا گیا تو جیاسوریا نے لانگ ہینڈل کا استعمال شروع کردیا اور ایک ہی ٹورنامنٹ میں ون ڈے انٹرنیشنل کرکٹ کی تیز ترین نصف سنچری (17 گیندیں) تیز ترین سنچری (48 گیندیں) اور ایک اوور میں سب سے زیادہ رنز 29 اور ایک اننگز میں سب سے زیادہ چھکے (11) رسید کرنے کے نئے عالمی ریکارڈ قائم کیے۔

ایک روزہ کرکٹ میں جیاسوریا کے کارنامے تسلیم شدہ تھے لہٰذا اس پر صرف ون ڈے کرکٹ کے کھلاڑی ہونے کا لیبل لگا دیا گیا۔ انگریز ماہرین کرکٹ جیاسوریا کی بڑائی ماننے میں عار محسوس کرنے لگے۔ ان کا کہنا تھا کہ جب تک کوئی کھلاڑی ٹسٹ کرکٹ میں نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کرتا اسے عظیم کھلاڑیوں میں کیسے شامل کیا جائے۔ جیاسوریا نے ان تمام کرکٹ پنڈتوں کی زبان اپنی اعلیٰ کارکردگی سے بند کرنے کا فیصلہ کیا اور پھر سب نے دیکھا کہ بھارت کے خلاف سیریز میں پہلے کولمبو ٹسٹ کے دوران میں اس نے برسوں سے قائم ٹسٹ ریکارڈز کا حشر کرڈالا۔ روشن ماہنامہ اور جیاسوریا نے مل کر ٹسٹ کرکٹ کی سب سے بڑی شراکت بناڈالی۔ بدقسمتی سے جیاسوریا صرف 35 رنز کی کمی سے برائن لارا کے ورلڈ ریکارڈ اسکور 375 تک نہ پہنچ سکا جس کا اسے خود بھی بہت رنج ہوا۔ بہرحال اس کی 340 رنز کی عظیم اننگز کی بدولت سری لنکا نے ٹسٹ کرکٹ کے سب سے بڑے مجموعی اسکور کا ورلڈ ریکارڈ بھی توڑ دیا اور 952 رنز بنا کر نیا ریکارڈ بنادیا۔ ون ڈے کرکٹ میں بھی زیادہ اسکور کا ریکارڈ سری لنکا کے پاس ہے۔ اس ٹسٹ میچ میں ریکارڈز کی ایسی برسات ہوئی جیسے ساون کی جھڑی ہو۔ نصف صدی تک قائم رہنے والے ریکارڈ اپنا وجود کھو بیٹھے۔ اس ٹسٹ کا ہیرو کوئی اور نہیں بلکہ صرف اور صرف جیاسوریا تھا۔

جیاسوریا ہر قسم کی باؤلنگ پر عمدگی سے کھیلنے کا فن جانتا ہے۔ آؤٹ ہونے پر اس کے تاثرات بڑے متاثر کن ہوتے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے اس کی دنیا ختم ہو گئی ہو۔ غلط اسٹروک کھیلنے پر اس کے چہرے سے ایسا ظاہر ہوتا ہے جیسے اس نے اپنی وکٹ گنوادی ہو اور یہی وہ سوچ ہے جس نے جیاسوریا کو ایک بڑا مستند اور عظیم کھلاڑی بنادیا ہے۔

ملازم (ہوٹل کے مینیجر سے): جناب اوپر کا مسافر شکایت کر رہا تھا کہ رات بارش میں اس قدر چھت ٹپکی کہ وہ سر سے پاؤں تک نہا گیا۔
مینیجر: ٹھیک ہے اس کے بل میں نہانے کے پیسے بھی شامل کر لو۔ (عرفان سنی' لاہور)

ایک آدمی نے ایک نہایت عالی شان دفتر بنایا' اسے بہترین فرنیچر سے آراستہ کیا' باہر بڑا سا بورڈ لگوایا جس پر جلی حروف میں لکھوایا۔ "خاندانی فقیر پاٹے خاں اینڈ سنز۔ اپنی زکات صدقات اور خیرات دے کر ثواب دارین حاصل کریں"۔

ایک دن اس کے ایک واقف کار نے اس کی وجہ پوچھی تو وہ یوں گویا ہوا۔ "ایک دفعہ میں بھیک مانگ رہا تھا۔ ایک عورت نے مجھ سے کہا۔ "یوں سڑک پر سرعام بھیک مانگتے ہوئے شرم نہیں آتی"۔ ..... اور واقعی اس دن مجھے بہت شرم آئی اور اس کے بعد میں نے اپنا بھیک آفس بنا لیا ہے۔ (انعمات حسن' لاہور)

پہلا آدمی (دوسرے سے): آپ دن میں کتنی بار شیو بناتے ہیں۔
دوسرا آدمی: یہی کوئی چالیس مرتبہ۔
پہلا آدمی: کیا آپ بے وقوف ہیں؟
دوسرا آدمی: جی نہیں' میں حجام ہوں۔ (عامر احمد میانوالی)

ایک سیاح کسی جگہ کی سیر کر رہا تھا۔ گائیڈ نے اس شہر کے کھنڈرات دکھاتے ہوئے کہا "ٹھیک 5 بج کر 10 منٹ پر ایک ہولناک زلزلہ آیا اور آس پاس کی عمارتیں ایک سیکنڈ میں ملبے کا ڈھیر بن گئیں۔

سیاح نے ایک مینار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "لیکن یہ مینار کس طرح بچ گیا؟"

"اس مینار کی گھڑی 5 منٹ آگے تھی"۔ گائیڈ نے جواب دیا۔ (عمیرہ لطیف' فیصل آباد)

ایک شخص ہوٹل میں داخل ہوا اور ایک جگہ بیٹھ کر بیرے کو خالی پلیٹ لانے کے لئے کہا۔ جب بیرے نے اسے پلیٹ لا دی تو اس آدمی نے اپنا بیگ کھولا اور کھانا پلیٹ میں رکھ کر کھانے لگا۔ مینیجر نے یہ دیکھا تو غصے سے کھول اٹھا اور چلایا "اے مسٹر یہ آپ کیا کر رہے ہیں"؟

"لیکن تم کون ہو؟" اس آدمی نے پوچھا۔

"بہت خوب' میں تمہیں ہی بلوانے والا تھا۔ ذرا ٹی وی کا سوئچ تو آن کر دو"۔ آدمی نے جواب دیا۔ (شمس القمر عاکف۔ فورٹ اٹک)

استاد (شاگرد سے): امجد بتاؤ تمہاری تاریخ پیدائش کیا ہے۔
شاگرد: 1988ء ق م
استاد (حیران ہو کر): ق م سے تمہارا کیا مطلب ہے۔
شاگرد: جناب قبل منیر' میں اپنے بھائی منیر سے دو سال پہلے پیدا ہوا تھا۔ (آسیہ شفیع خانیوال)

دلچسپ اور ناقابلِ یقین

عبدالستار خان طاہر

سانپوں کے ساتھ

1980ء میں جنوبی افریقہ کے سفید فام باشندے "پی ٹر سی من" جس کی عمر 25 سال تھی نے جو مظاہرہ کیا تھا یہ سن کر ہی جسم پر کپ کپی طاری ہو جاتی ہے۔ اس نے دس فٹ لمبے اور آٹھ فٹ چوڑے پنجرے (دڑبے) میں دنیا کے سب سے زیادہ زہریلے 24 سانپوں کے ساتھ مسلسل 36 دن اور 36 راتیں گزاری تھیں۔ یہ نہ سمجھیے کہ پیٹر سپیرا تھا یا اس کے پاس سانپوں کو رام کیے رکھنے کا کوئی جادو تھا۔

اصل میں بات یہ ہے کہ اگر بے حس اور ساکن بیٹھے رہیں تو سانپ آپ کے جسم کے ساتھ آلگے تو بھی آپ کو نہیں کاٹے گا۔ لیکن بات تو یہی ہے کہ سانپ اتنا قریب ہو حتیٰ کہ آپ کے جسم پر رینگنے لگے تو آپ کیسے پر سکون اور ساکن بیٹھ سکیں گے؟ بس آپ نے ذرا سی حرکت کی اور سانپ نے آپ کو ڈس لیا۔ پیٹر سی من نے اسی قوت برداشت اور قوت ارادی کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ 36 دن بے حس و حرکت اس تنگ سے دڑبے میں بیٹھا رہا۔ اس کے منہ پر مکھی بیٹھی، اس نے کوئی حرکت نہ کی۔ اگر مچھر نے کاٹا تب بھی وہ ساکن رہا۔ ایک رات ٹھنڈ زیادہ ہو گئی۔ سانپ اس کے جسم سے لپٹ گئے۔ دو چار اس کے کپڑوں کے اندر بھی چلے گئے۔ کیوں کہ اس کے جسم سے سانپوں کو حرارت مل رہی تھی۔ یہ مختلف اقسام کے سانپ اس قدر زہریلے تھے کہ جسے ڈس لیتے وہ چند منٹوں میں مر جاتا۔ چھتیس دن پورے ہوئے تو سانپوں کے ماہرین نے پہلے سانپوں کو باہر نکالا پھر "پیٹر" باہر نکلا۔ اس نے کہا "میرا اعصابی نظام بری طرح متاثر ہوا ہے لیکن میں نے روحانی قوت کا اندازہ لگا لیا ہے"۔

قدیم مصر میں

قدیم مصر میں مندرجہ ذیل اعداد ان اشکال سے ظاہر کیے جاتے تھے۔ ایک کا ہندسہ عمودی لائن، دس گھوڑے کا نعل، ایک سو پیچ، دس ہزار اشارہ کرتی ہوئی انگلی، ایک لاکھ چھلانگ لگاتا ہوا مینڈک، دس لاکھ اداس چہرہ۔
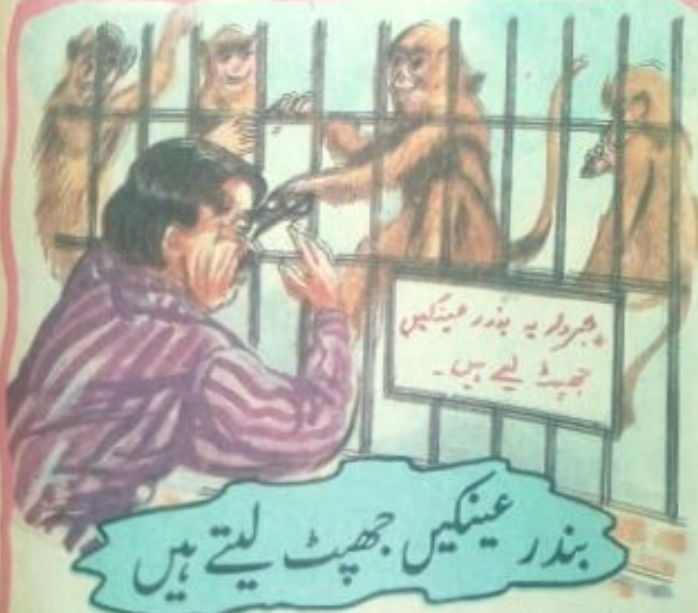
بندر عینکیں جھپٹ لیتے ہیں

کربے مس پرنن، برطانیہ میں ایک چڑیا گھر کی انتظامیہ نے اپنے شائقین کو دو سو اسی ڈالر ہرجانہ ادا کیا۔ ہرجانہ کا

ب چڑیا گھر کے بندر تھے۔ جو شائقین کی چیزیں آنکھ جھپکنے
میں اڑا لیتے ہیں۔ خاص طور پر عینکیں۔ جوں ہی تماشائی ان
کے پنجرے پر لکھی ہوئی عبارت پڑھنے کے لیے جھکتے ہیں
بندر ان کی ناک پر سے فوراً عینک جھپٹ لیتے ہیں۔ وہ
عبارت کچھ یوں ہے "خبردار یہ بندر عینکیں جھپٹ لیتے
ہیں۔"

انوکھا مقابلہ

یوگوسلاویہ (جو کہ اب ٹوٹ کر چھ ریاستوں میں
تبدیل ہو چکا ہے) کے ایک اخبار نے 80 میل کی ایک دوڑ
کا اہتمام کیا۔ یہ دوڑ زاغ رب سے لب لجانہ تک تھی۔ اس
دوڑ کے شرکاء میں ٹیلی فون، تار، کار اور پیغام رساں کبوتر شامل
تھے۔ جوں ہی کار اسٹارٹ ہوئی، ٹیلی فون پر کال بک کرا دی
گئی۔ ایک تار روانہ کیا گیا۔ چار پیغام رساں کبوتر چھوڑے
گئے۔ کار نے یہ فاصلہ ایک گھنٹے بتیس منٹ میں طے کیا۔
ٹیلی فون کال چھ گھنٹے بعد ملی۔ تار نے یہی فاصلہ دو گھنٹے اور
... منٹ میں طے کیا۔ دو کبوتر دو گھنٹے اور انچاس منٹ میں
منزل پر پہنچے جب کہ دو کبوتر راستے سے بھٹک گئے اور
واپس نہ آسکے۔

خوش نصیب اور بد نصیب

"میری رمولی نو" دنیا کی وہ خوش نصیب عورت تھی
... کے بچوں میں سے زیادہ تر کو حکم رانی نصیب ہوئی۔
... 1750ء میں پیدا ہوئی۔ اس کی شادی "اجاکس یو" کے
... مختار کارلو بونا پارٹ سے ہوئی۔ اس کے تیرہ بچے تھے۔
... بڑا بیٹا جوزف سپین کا بادشاہ بنا۔ دوسرے بیٹے نپولین
بونا پارٹ کو بہت شہرت ملی اور فرانس کا بادشاہ بنا۔ دو بیٹے
جیروم اور لوئی علی الترتیب ویسٹ فالیا اور ہالینڈ کے بادشاہ
بنے۔ ایک لڑکی میریا کیرولین نیپلز کی ملکہ بنی۔ اس کی بہن
الیائس کانا کی ملکہ بنی۔ باقی بچوں میں سے لیوشین "کانینو" کا
شہزادہ تھا۔ میری پالین گو آٹالا کی ڈچس بنی۔ میری رمولی نو
نے اپنے بچوں کا عروج اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ دوسری
طرف وہ بدنصیب بھی تھی کہ تمام بچے اس کی زندگی میں ہی
فوت ہوئے اور آخر کار اپنے خاندان کی تباہی کے بیس برس
بعد 1836ء میں وہ خود بھی دنیا سے رخصت ہو گئی۔

ایک من بیس سیر وزن کے انسان میں

چربی اتنی مقدار میں ہوتی ہے کہ اگر اسے صابن
بنانے کے لیے استعمال کیا جائے تو ایک ایک پاؤ کی چھ ٹکیاں
تیار کی جا سکتی ہیں۔ کاربن کی مقدار اتنی کہ نو ہزار پنسلوں
کے لیے سکہ بن سکتا ہے۔ فاسفورس اتنا کہ اس سے دو ہزار
دو سو دیا سلائیوں کا مسالہ بنایا جا سکتا ہے۔ گندھک اتنی کہ
ایک سو پچاس پٹاخے بنائے جا سکتے ہیں۔ چونا اتنا کہ درمیانے
درجے کے ایک کمرے میں سفیدی کی جا سکتی ہے۔ خون
میں لوہا اتنا کہ دو انچ لمبی ایک کیل بنائی جا سکتی ہے۔ جب
کہ میگنیشیم تقریباً ایک چمچہ ہوتی ہے۔ تقریباً دس گیلن پانی
ہوتا ہے۔ پانی کے متعلق وضاحت یہ ہے کہ انسان کے جسم
کا ساٹھ فی صد پانی ہے۔ ہڈیاں بظاہر ٹھوس اور سخت ہیں
لیکن ان کے وزن میں آدھا پانی، آدھا چونا اور فاسفورس
ہوتا ہے۔ جب کہ خون میں نوے فی صد پانی ہے۔

ایک منٹ میں

ایک جوان اور تن درست آدمی ایک منٹ میں دو سو
گز چل سکتا ہے۔ چار سو گز دوڑ سکتا ہے۔ ایک سو پچاس
الفاظ بول سکتا ہے۔ اور تیس سے چالیس تک الفاظ لکھ سکتا
ہے۔ تین سو سے کچھ زائد الفاظ سمجھ کر پڑھ سکتا ہے۔ چار
سو دس مکعب انچ ہوا جسم کے اندر لے جا کر باہر نکال سکتا

انسان کا دل ایک منٹ میں تقریباً سات سیر خون رگوں میں ادھر سے ادھر کرتا ہے۔

اگر

اگر انسان ستر سال تک زندہ اور صحت مند رہے تو اس عرصے میں ساڑھے پانچ سو من اناج' چنے اور دالیں وغیرہ۔ سبزیاں اور پھل ایک سو تیس من اور گوشت اسی من کھا چکا ہوتا ہے۔ بائیس ہزار گیلن پانی' ایک لاکھ پیالیاں چائے اور تقریباً اسی ہزار سگرٹ پی چکا ہوتا ہے (اگر وہ سگریٹ پیتا ہے تو)۔ ستر سال میں انسان کا دل تین ارب مرتبہ دھڑکتا ہے۔ اور تین لاکھ من خون صاف کر کے سارے جسم کو سپلائی کرتا ہے۔ تریسٹھ کروڑ سانسیں لیتا ہے۔ ستر سال کی عمر تک انسان بیس سال سوتے گزار دیتا ہے۔

کے بغیر

انسان ہوا کے بغیر تین منٹ' پانی کے بغیر تین دن اور خوراک کے بغیر تین ہفتے زندہ رہ سکتا ہے۔ جوان آدمی مسلسل چوراسی گھنٹے نیند کے بغیر گزار سکتا ہے۔

حرارت اور توانائی

انسان کے جسم میں اتنی توانائی ہوتی ہے کہ اگر اسے بجلی کی قوت میں تبدیل کیا جائے تو اس سے 25 واٹ کا بلب چند منٹ تک روشن رہ سکتا ہے۔ جسم میں حرارت اتنی ہوتی ہے کہ چائے کی تین پیالیاں آسانی سے تیار کی جا سکتی ہیں۔

بچّے کی ہڈیوں کی تعداد

ماں کے پیٹ میں بچے کے جسم کی ہڈیوں کی تعداد دو سو ستر ہوتی ہے اور جب وہ پیدا ہوتا ہے تو دو سو چھ ہڈیاں رہ جاتی ہے۔ اگر پیدائش کے بعد بھی ہڈیوں کی تعداد دو سو ستر رہتی تو انسان کی شکل و صورت اور جسم کی ساخت اتنی مختلف ہوتی کہ وہ عجیب و غریب لگتا۔

سونے کی فائرنگ

تاریخ کی سب سے مہنگی فائرنگ 1296ء میں مسلمان فاتح علاء الدین خلجی نے کی تھی۔ اس نے ... پر فوج کشی کی تو راستے میں آنے والے راجوں' مہ... کی فوجوں کو کچلتا دلی جا پہنچا۔ دلی کا قلعہ اور اس کی ... بہت مضبوط تھا۔ علاء الدین خلجی نے شہر کا محاصرہ کیا ... طویل ہو گیا کہ شہر کے اندر دلی کے باشندوں اور فو... پاس خوراک اور پانی کا ذخیرہ ختم ہو گیا۔ مگر وہ ہتھیار ... پر آمادہ نہ ہوتے تھے۔ علاء الدین خلجی اتنے لمبے محا... اور دشمن کی ہٹ دھرمی سے تنگ آگیا۔ اس کے پاس ... شمار سونا ٹکڑوں کی صورت میں تھا اور کرنسی کے ... بہت زیادہ تھے۔ اس نے پتھر پھینکنے کی بجائے سو... سکوں سے بھرے ہوئے تھیلے جو کمزور سے کپڑوں ک... ہوئے تھے' "منج نی قوں" سے شہر میں پھینکنے شرو... دیئے۔ بیش قیمت تھیلے شہر اور قلعے کی دیواروں کے او... اڑتے ہوئے شہر کے اندر زمین پر گرنے لگے۔ ان ... کمزور تھا جو تھیلا گرتے ہی پھٹ جاتا تھا۔ شہر میں سو... سکوں کی بارش ہوئی تو لوگ ان پر ٹوٹ پڑے۔ دیو... سے ہندو سپاہیوں نے دیکھا تو وہ بھی دوڑتے ہوئے ... اور دولت سمیٹنے لگے۔ شہریوں اور فوجیوں میں دھکم پ... چھینا جھپٹی شروع ہو گئی۔ ان پر دولت برستی رہی ا... الدین خلجی کے سپاہی کمندیں پھینک کر دیوار پر چڑھ... اس طرح شام تک قلعہ فتح ہو گیا۔ جم کر لڑنے وا... فوج اب سونا اور سکے لوٹتی ہوئی گرفتار ہو گئی۔ ا... الدین خلجی نے حکم جاری کیا کہ جس شہری اور ہندوستا... سے سونے کا ٹکڑا یا سکہ برآمد ہوا اسے سزائے مو... جائے گی۔ لہٰذا ایک دن کے اندر اندر تمام سو... ٹکڑے اور سکے واپس کر دو۔ اس طرح علاء الدین ... اگلے دن اپنا تمام خزانہ واپس لے لیا۔ اور یوں اس ... اس انوکھی چال سے دلی کا مضبوط قلعہ اور شہر فتح کر...

بچپن میں جب یہ ضرب المثل پڑھی "جنگل کی آگ کی طرح پھیلنا"۔ اس وقت اس کا مطلب تو سمجھ میں آگیا یعنی کسی بات یا خبر کا انتہائی تیزی سے پھیلنا۔ لیکن یہ بات سمجھ میں نہ آسکی کہ جنگل میں آگ کیسے لگ سکتی ہے؟ آگ کے لیے خشک لکڑیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب کہ جنگل تو نام ہے سرسبز و شاداب درختوں کا' ہرے بھرے پودوں کا۔ اس سبزے میں آگ کیسے لگ سکتی ہے؟ میں اس وقت تک اس بات کی حقیقت نہ سمجھ سکا جب تک ایک ہول ناک حادثے سے نہیں گزرا۔

یہ اس وقت کی بات ہے جب میں دسویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ اسکول ہمارے گاؤں سے 3 کلو میٹر کے فاصلے پر تھا۔ ہم ٹھہرے دیہاتی' یہ فاصلہ ہمارے گاؤں کے لڑکوں کے لیے کچھ بھی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ میں اور میرا جگری دوست شیراز جب آپس میں گپ شپ لگاتے ہوئے گاؤں سے نکل کر اسکول کی راہ پکڑتے تو فاصلہ طے ہونے میں کچھ بھی دیر نہ لگتی۔ اسکول جانے کے دو راستے تھے۔ ایک راستہ جنگل کے عین درمیان سے ایک قدرتی نالے کے ساتھ ساتھ جاتا تھا۔ یہ راستہ قدرے کم طویل تھا۔ لیکن اسے بہت کم استعمال کیا جاتا تھا کیوں کہ یہ کوئی باقاعدہ راستہ نہیں تھا۔ جھاڑ جھنکار میں سے گزرنا پڑتا تھا۔ دوسرا نیم پختہ راستہ طویل تھا' لیکن صاف ستھرا ہونے کی بنا پر اسے ہی ترجیح دی جاتی تھی۔

گرمی کا موسم تھا۔ گزشتہ تین ماہ سے بارش کا ایک قطرہ بھی نہ برسا تھا۔ بادل آتے تھے لیکن بن برسے گزر جاتے تھے۔ ہوا بھی اتنی خشک اور گرم تھی کہ جسموں کو جھلسائے دیتی تھی۔ ہمیں اس موسم کی وجہ سے اسکول جانا بہت ہی دشوار لگتا تھا لیکن اس آگ برساتے موسم میں بھی ہم جاتے تھے اور ہر روز جاتے تھے۔ وہ بھی ایسا ہی گرم دن تھا۔ اسکول سے چھٹی کے بعد شیراز بہت تیزی کے ساتھ نکلا۔ میں اس کی طرف لپکا۔ "کیا بات ہے؟ بہت جلدی میں ہو"۔

"ہاں احمد' آج ہمارے گھر مہمان آنے والے ہیں.... مجھے جلدی گھر پہنچنا ہے"۔

"تو...!" میرے منہ سے نکلا

"تو یہ کہ میں جنگل کے راستے سے جاؤں گا" شیراز چلتے ہوئے بولا

"میں.... کیا مطلب! تم آج اکیلے جاؤ گے؟" میں نے حیران ہو کر کہا۔

"اکیلا اس لیے کہ تمہیں جنگل کے راستے سے گھر

جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے" شیراز نے مسکراتے ہوئے میری کم زوری کا اعلان کیا۔

"تم تو بہت بہادر ہو نا' جاؤ.... اب اکیلے ہی جاؤ گے" میں نے بھنا کر کہا۔

شیراز ہنستا ہوا جنگل کے راستے کی طرف بڑھ گیا جب کہ میں دوسرے راستے پر چل پڑا۔ اب قدرت کا کرشمہ دیکھیے۔ ہمارے گاؤں کے ایک زمین دار نواب دین کا ٹریکٹر وہاں سے گزر رہا تھا۔ انھوں نے مجھے بھی اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ یوں میں منٹوں میں گھر پہنچ گیا۔ میں دل ہی دل میں شیراز پر ہنس رہا تھا کہ جب وہ مجھے پہلے سے یہاں موجود پا کر حیران ہو گا تو کتنا مزا آئے گا۔ میں نے کھانا بہت جلدی میں کھایا۔ شیراز سے جو ملنا تھا۔ کھانے سے فارغ ہوتے ہی میں گھر سے باہر آگیا اور جنگل سے آنے والے راستے کی طرف نظریں جما دیں۔

شیراز ابھی تک نہیں پہنچا تھا۔ میں بے چینی سے کبھی گھڑی کی طرف اور کبھی جنگل سے نکلنے والے راستے کی طرف دیکھتا۔ ایسے میں ہی میری نظر اس لہراتے' بل کھاتے دھویں پر پڑی جو دور جنگل کے درختوں میں سے اٹھ رہا تھا۔ پہلے تو غائب دماغی سے اس دھویں کو گھورتا رہا۔ پھر ایسے لگا جیسے کسی خیال نے میرے دماغ کو بجلی کا جھٹکا سا لگا دیا ہو۔ جنگل سے دھواں اٹھنے کا مطلب جنگل کی آگ بھی ہو سکتا تھا۔ ابھی میں اس منظر کو دیکھ ہی رہا تھا کہ گاؤں کے کتنے ہی لوگ وہاں جمع ہو گئے۔ وہ بھی جنگل میں لگی آگ کو خطرہ سمجھ کر پریشان ہو رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے آگ بھڑک اٹھی۔ تیز ہوا نے آگ کو بڑی سرعت سے پھیلا دیا۔ مجھے رہ رہ کر شیراز کا خیال آرہا تھا۔ وہ یقیناً آگ میں پھنس گیا تھا۔ گاؤں کے لوگوں کو جب میں نے شیراز کے بارے میں بتایا تو وہ اسے بچانے کے لیے بے تاب ہو گئے۔ کتنے ہی جوان جنگل کی طرف دوڑ گئے۔ میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ لیکن ابھی زیادہ دور نہیں گئے تھے کہ آگ کی تپش نے سب کو واپس لوٹنے پر مجبور کر دیا۔ آگ بھڑکتی ہی جا رہی تھی۔ لوگوں کے دل اس احساس سے بیٹھے جا رہے تھے کہ ان کے گاؤں کا ایک لڑکا آگ کی لپیٹ میں آگیا ہے۔

شیراز گو کہ مجھ سے ناراض ہو کر گیا تھا لیکن بہرحال وہ میرا دوست تھا اور میں اسے یوں آگ کی نذر ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں نے اپنے ذہن میں سوچا کہ اگر میں اس کی جگہ یوں آگ میں پھنس جاتا تو کیا کرتا۔ مجھے کچھ زیادہ نہیں سوچنا پڑا.... جس راستے سے شیراز نے آنا تھا وہ تو آگ کے شعلوں میں لپٹا ہوا تھا۔ یہ سوچتے ہی شیراز کے بچاؤ کے لیے میرے ذہن میں جنگل میں بہنے والے قدرتی نالے کا تصور ابھر آیا۔ اب اس تصور میں صرف ایک خرابی تھی کہ میں تیرنا جانتا تھا اور شیراز تیراکی کی الف بے سے بھی واقف نہیں تھا۔ لیکن مجھے پختہ یقین تھا کہ آگ سے بچنے کا واحد راستہ صرف نالہ ہے اور شیراز نے اس کے کم گہرے حصے میں پناہ لے رکھی ہو گی۔ میں ہوتا تو تیر کر باہر نکل آتا لیکن شیراز نہیں آسکتا تھا اور اب مجھے اسے بچا کر لانا تھا۔ چوں کہ یہ صرف میرا خیال ہی تھا کہ اس نے نالے میں پناہ لے رکھی ہو گی۔ اس لیے میں کسی سے بھی اس کا ذکر کیے بغیر اس طرف چل پڑا جدھر سے نالہ جنگل میں داخل ہوتا تھا۔ ادھر پانی کی گہرائی دس بارہ فٹ سے کم نہ تھی۔ البتہ چوڑائی کہیں تو بیس فٹ اور کہیں اس سے کم تھی۔

میں نے کپڑے اتار کر اپنے ساتھ لائی ہوئی نیکر پہن لی اور نالے میں کود پڑا۔ اس نالے میں میں نے کئی بار تیراکی کی تھی اور مجھے یقین تھا کہ اس مشق کی بدولت میں ایک ڈیڑھ گھنٹا آسانی سے تیر سکتا تھا۔ پھر بھی ہر دس منٹ کے بعد میں ذرا رک کر دم لے لیتا تھا۔ نالے کے دونوں طرف درخت جل رہے تھے۔ میں اب محتاط ہو کر تیرنے لگا۔ جلتی ہوئی شاخیں اور انگارے اڑ اڑ کر نالے میں گر رہے تھے۔ میں پانی کے اندر ہی تیرنے لگا۔ صرف سانس لینے کے لیے سطح پر آتا۔ ایک مرتبہ جیسے ہی میں غوطہ کھا کر ابھرا' ایک درخت کی جلتی ہوئی بھاری بھر کم شاخ میرے سر سے ٹکرائی اور میری چیخ نکل گئی۔ میرے سر کے بال اور

بالیاں کان بری طرح جل گئے تھے۔ میرے ہوش و حواس غائب ہوئے جا رہے تھے۔ مگر میں دوبارہ بچتا بچاتا تیرنے لگا۔ اب میں شیراز کو اونچی آواز میں پکارتا جا رہا تھا۔ پھر اچانک وہ مجھے نظر آگیا۔ وہ نالے میں ہی چھپا ہوا تھا۔ لیکن وہ بالکل کنارے پر تھا اور اس نے کنارے کو مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔

مجھے دیکھ کر پہلے اس کی آنکھوں میں بے یقینی کا تاثر ابھرا، پھر خوشی اس کے لبوں پر مسکراہٹ بن کر دوڑ گئی۔ میں تیرتا ہوا اس کے قریب جا پہنچا۔ وہ واقعی کم گہری جگہ پر کھڑا تھا۔ وہ بے اختیار گھاس کو چھوڑ کر میرے گلے سے لپٹ گیا۔

"شکر ہے تم آگئے"۔

"ہاں، مجھے تو آنا ہی تھا"۔

"ہیں.... یہ کیا کہا؟" شیراز ایک جھٹکے سے مجھ سے الگ ہو گیا۔

"ہاں بھئی، تمہارا دوست جو ہوں.... آخر تمہیں بچانے کے لیے کیوں نہ آتا"۔

"لیکن.... یہ آگ....!" شیراز نے جلتے ہوئے درختوں کی طرف اشارہ کیا۔ اس کے اشارہ کرنے کی دیر تھی کہ دو تین بھاری بھر کم جلتے ہوئے درخت نالے میں بالکل قریب آگرے اور ہم دونوں خوف زدہ ہو کر دور ہٹ گئے۔ شیراز کا چہرہ تو زرد پڑ گیا تھا۔ میں بھی پریشان ہو گیا۔ کیوں کہ کیمپ کی طرف جانے والے راستے پر اب آدھ جلے درختوں کا ڈھیر لگ گیا تھا۔ میری پریشانی کی ایک وجہ اور تھی کہ جل جل کر درختوں کے تنے کمزور ہوتے جا رہے تھے۔ چوں کہ اکثر درختوں کا جھکاؤ نالے کی طرف تھا اس لیے اب وقفے وقفے سے درخت نالے میں گرنا شروع ہو چکے تھے۔ یہ جلتے ہوئے درخت ہمارے آگے پیچھے گر رہے تھے اور ہماری راہ میں رکاوٹیں پیدا ہوتی جا رہی تھیں۔

"مجھے تو تیرنا بھی نہیں آتا" شیراز روہانسی آواز میں بولا۔

"مجھے تو آتا ہے، میں تمہیں یہاں سے نکال کر لے جاؤں گا، ان شاء اللہ!" میں نے پر عزم انداز میں اس کا کندھا تھپ تھپایا۔ پھر میں نے اسے سمجھایا کہ تیرنا کوئی مشکل کام نہیں۔ تھوڑی سی تکنیک کی ضرورت ہے۔ خوف کے اس عالم میں شیراز نے بہت جلد میری سمجھائی ہوئی باتوں کو سمجھ لیا۔ میں نے اسے اپنے ایک بازو کی مدد سے تیرتے ہوئے کھینچا۔ وہ بھی ہلکے پھلکے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ لیکن پھر اچانک ہمیں رکنا پڑا۔ درخت پانی میں آگ لگا رہے تھے۔ میں اکیلا ہوتا تو کب کا بچ کر نکل گیا ہوتا لیکن شیراز کی وجہ سے مجھے بھی اب راہ دشوار ہوتی نظر آرہی تھی۔ میں نے شیراز کو ایک کم گہری جگہ کھڑا کر دیا اور خود غوطہ لگا کر نالے کی تہ میں جا پہنچا، درخت نیچے تہ تک پہنچے ہوئے تھے۔ میں نے درخت کے ایک تنے کو دھکیلنے کی کوشش کی لیکن وہ ابھی تک گرم تھا۔ دوسرے درختوں کو چھوا، وہ تھے تو ٹھنڈے لیکن انہیں ہلانا میرے لیے مشکل تھا۔ میں نے بہت دیر سے سانس روکا ہوا تھا اور اب مجھے بہت دقت ہو رہی تھی، چنانچہ میں سانس لینے کے لیے اوپر سطح پر ابھر آیا۔ شیراز نے میری طرف پر امید نگاہوں سے دیکھا۔ میں نے مسکرا کر اسے تسلی دی۔ لیکن اچانک شیراز کی آنکھوں میں خوف ابھر آیا۔ وہ چیخا "احمد.... بچو!"

میں نے بجلی کی سی تیزی سے غوطہ لگایا۔ اس کے ساتھ ہی ایک جلتا ہوا درخت اس جگہ پر گرا جہاں میں تھوڑی دیر پہلے کھڑا تھا۔ وہ میرے پیچھے پیچھے پانی میں ڈوب رہا تھا۔ میں تیرتا ہوا اس کی زد سے باہر نکل گیا۔ باہر شیراز آنکھوں میں آنسو لیے کھڑا تھا۔ وہ سمجھا تھا کہ میں اب نہیں بچوں گا۔ مجھے دیکھ کر اس نے میری طرف بڑھنا چاہا لیکن میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا اور دوبارہ غوطہ لگایا۔ میں درختوں کے جلے ہوئے تنوں میں سے نکلنے کا راستہ تلاش کرنا چاہتا تھا۔ لیکن درختوں کے اس ڈھیر میں میں اتنا راستہ تلاش نہ کر سکا جس میں سے ہم گزر سکتے۔ میں مایوس ہو کر پھر اوپر سطح پر آگیا۔ میرے چہرے پر مایوسی

تھی۔ شیراز نے بے بسی کے ساتھ میری طرف دیکھا۔ میں تیرتا ہوا اس کی طرف بڑھ گیا۔

"اب کیا ہو گا؟" شیراز نے مایوسی سے کہا "مشکل ہے، ہمیں راستہ نہیں ملے گا۔ سب راستے بند ہو گئے ہیں"۔

"سب راستے بند ہو جائیں تب بھی امید کا راستہ کھلا رہتا ہے" میں نے اسے کھینچتے ہوئے کہا۔

گاؤں کی سمت بہنے والا پانی بھی درختوں سے محفوظ نہیں تھا۔ درختوں کا ڈھیر دیکھ کر میری ہمت جواب دے گئی۔ باہر انگارے برس رہے تھے اور اندر پانی میں درخت گر گر کر اپنی آگ بجھا رہے تھے۔ میں نے شیراز کو کنارے کے قریب کھڑا کیا اور خود راستہ پانے کے لیے غوطہ لگایا۔ گو کہ نیچے دبے ہوئے درختوں کی آگ بجھ چکی تھی لیکن پانی میں جلتے ہوئے درخت کے اوپر والے حصے ابھی تک جل رہے تھے۔ اس لیے پانی کے نیچے بھی حرارت محسوس ہو رہی تھی۔ دو تین بار غوطہ لگا کر بھی سوائے ناکامی کے اور کچھ ہاتھ نہ آیا۔ لیکن ہمیں وہاں سے ہر صورت نکلنا تھا۔ اس لیے بار بار کوشش کے بعد ایک کونے کا درخت قدرے کمزور نظر آ ہی گیا۔ میں نے اسے ہلانے کی کوشش کی۔ تو وہ اپنی جگہ سے تھوڑا سا سرک گیا۔

میں سطح پر ابھر آیا۔ شیراز کو میں نے اچھی طرح سمجھا دیا کہ جیسے ہی میں درخت کو سرکاؤں وہ فوراً تیر کر دوسری طرف نکل جائے۔ شیراز میرے ساتھ غوطہ لگانے سے ڈر رہا تھا۔

ہم دونوں کھلی آنکھوں سے سیاہ تنوں کے ڈھیر کو دیکھ رہے تھے۔ میں نے اپنے ہدف کے قریب پہنچ کر شیراز کا ہاتھ چھوڑ دیا اور پوری قوت سے درخت کے تنے کو پہلے دھکیلا اور پھر اسے اوپر اٹھایا۔ لیکن اس کے اوپر اٹھاتے ہی دوسرے تنے بھی ہلنے لگے۔ میں نے شیراز کو سر کے اشارے سے نکلنے کے لیے کہا۔ وہ بے چارا سانس روکے ہلکان کھڑا تھا۔ فوراً تڑپ کے اس تنے کے نیچے سے دوسری طرف نکل گیا۔ اب میرے نکلنے کا مسئلہ تھا۔

اس وقت میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب شیراز اوپر سطح کی طرف جانے کی بجائے میری طرف آیا اور دوسری طرف سے تنے کا بوجھ اٹھا لیا۔ میں نے ایک سیکنڈ کی بھی دیر نہ کی کیوں کہ آگے پیچھے اور اوپر نیچے کے درخت کسی بھی لمحے گر کر پھر سے راستہ بند کر سکتے تھے۔ دوسری طرف نکلتے ہی میں نے شیراز کو تنا چھوڑنے کے لیے کہا۔ لیکن اس سے پہلے ہی اس کا جسم لہرایا' قریب تھا کہ وہ درخت کے نیچے دب جاتا' میں نے اسے کھینچ لیا اور تیزی سے اوپر لپکا۔ اس نے زندگی میں کبھی اتنی دیر تک سانس نہیں روکی تھی۔ اس وجہ سے وہ نیم بے ہوش سا ہو گیا تھا۔ میں اسے بڑی مشکل سے سطح پر لے آیا۔ لیکن باہر درخت انگارے برسا رہے تھے' اس لیے پانی کے اندر رہنا ہی بہتر تھا۔ میں نے اور شیراز نے کچھ دیر اپنے حواس بحال کیے اور پھر تیرنا شروع کر دیا۔ شیراز کو زیادہ تر میں ہی سنبھال پڑ رہا تھا۔ ہم ابھی راستے ہی میں تھے کہ گاؤں کے کچھ اور نوجوان بھی تیرتے ہوئے وہاں آن پہنچے۔

میں نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔ کیوں کہ اب میں تیرنے میں دقت محسوس کر رہا تھا۔ ان نوجوانوں نے بتایا کہ بعد میں انہوں نے مجھے تلاش کیا لیکن جب میں نہ ملا تو سب پریشان ہو گئے۔

وہ یہ تو سمجھ گئے تھے کہ میں شیراز کو بچانے کے لیے گیا ہوں لیکن کیسے اور کس راستے سے' یہ نہ سمجھ سکے۔ پھر ایک بچے نے انہیں بتایا کہ اس نے مجھے نالے کی طرف جاتے دیکھا ہے۔ تب وہ سمجھ گئے۔ یوں ہماری مدد کے لیے آ پہنچے۔ اس کے بعد ان کی مدد سے ہم بغیر کسی دشواری کے گاؤں پہنچ گئے۔ اس خطرناک آگ کی یاد آج بھی دل میں تازہ ہے۔ لیکن اب میں اس محاورے پر ہنستا نہیں ہوں۔ کیوں کہ اب مجھے پتا چل گیا ہے کہ جب شدید گرمی میں درخت خشک ہو جائیں تو تیز ہوا کی رگڑ سے جل اٹھتے ہیں۔

☆ ☆ ☆

آپ کا خط ملا

دل تو یہ کرتا ہے کہ میں آپ کی لاڈلی ردی کی ٹوکری کو اٹھا کر باہر پھینک دوں۔ میں پتا نہیں کتنے خط لکھ چکی ہوں۔ مگر آفرین ہے آپ کی اس ٹوکری پر اور آپ پر بھی۔ میں نے یہ آزمایا ہے کہ جو بھی آپ کی تعریف کرتے ہیں ان کے خط شائع ہوتے ہیں۔ تنقید آپ برداشت کر ہی نہیں سکتے۔ ویسے اس مہینے کا رسالہ بہت اچھا تھا۔ کہانیاں ساری ہی اچھی تھیں لیکن جو زیادہ پسند آئیں ان میں فرض ادا کرنا ہو گا اور اتوار بازار تھیں (عاصمہ انصار رائے' ملک وال)

اتوار بازار' کارٹون کہانی اور آخری حربہ بہت پسند آئیں۔ کھیلوں کی دنیا ختم کر کے مجرم کون کا سلسلہ شروع کریں۔ قائداعظم کلاسک کی پچھلی اقساط کا خلاصہ بھی دیا کریں (نریمان بسما پشاور)

ٹائٹل بہت جاذب نظر تھا۔ اداریہ میں سلسلہ وار ناول کا پڑھ کر خوشی دوبالا ہو گئی۔ تحریروں میں فرض ادا کرنا ہو گا' ہمسائے' اور پانچ سیکنڈ کا آپریشن بالترتیب پہلے دوسرے اور تیسرے نمبر پر رہیں۔ حسن ذکی کاظمی کی "سائنس فکشن" بہت ونڈر فل تھی' اشفاق احمد خاں کی تحریر بھی بہت متاثر کن تھی۔ رضوان ثاقب کا کالم مجاہدین آزادی موجود نہ تھا کیوں؟ (حسن جاوید فیصل آباد)

سرورق اچھا تھا' کہانیوں میں فرض ادا کرنا ہو گا' ہمسائے' پانچ سیکنڈ کا آپریشن اور کمانڈو اچھی تھیں۔ لطائف کے دو صفحے کر دیں (ثیب ہاشمی حسن ابدال)

دسمبر کی تمام کہانیاں لاجواب تھیں۔ میں اپنے تعلیم و تربیت سے امید رکھتا ہوں کہ یہ نئے سال کی خوشی میں ہمیں لاجواب خوش خبریاں سنائے گا۔ جنوری 98ء سے بلاعنوان ختم کر کے مجرم کون کا سلسلہ بھی شروع کر دیں (محمد سلیم میاں چنوں)

سرورق عمدہ تھا۔ تمام کہانیاں نمبرون تھیں۔ خاص طور پر کمانڈو' آپی اور پانچ سیکنڈ کا آپریشن بہت پسند آئیں (آمنہ منظور بٹوکی)

سرورق بہت عمدہ تھا۔ تمام کہانیاں بہت دل چسپ تھیں۔ واقعی تعلیم و تربیت لاجواب اور بے مثال ہے (سائرہ واحد لاہور)

سرورق بہت شان دار تھا۔ کہانیوں میں کمانڈو اور ہمسائے بہت پسند آئیں۔ ان شاء اللہ ہمیں آیندہ بھی تعلیم و تربیت ویسا ہی ملتا رہے گا جیسا ہم چاہتے ہیں (رابعہ علی چودھری لاہور)

دسمبر کے شمارے کا سرورق عمدہ تھا۔ تمام کہانیاں نمبرون تھیں۔ نظموں میں قائداعظم بہت پسند آئی۔ باقی تمام سلسلے بھی بہت اچھے تھے۔ غرض تعلیم و تربیت میں وہ تمام خوبیاں ہیں جو ایک اچھے رسالے میں ہونی چاہیں (ثنا یونس' فیصل آباد)

سرورق بہت پسند آیا۔ تمام کہانیاں اچھی تھیں۔ خاص طور پر سید نظر زیدی کی کہانی نے بہت متاثر کیا (خرم شہزاد شورکوٹ)

دسمبر کا تعلیم و تربیت بہت اچھا ہے۔ میری ایک تجویز ہے اقوال زریں شروع کریں (ایم سلیم شاہین جوکھید' کراچی)

سرورق بہت ہی عمدہ تھا۔ تمام کہانیاں اچھی تھیں۔ کارٹون کہانی بہت پسند آئی۔ لطیفے اتنے اچھے تھے کہ میری ہنسی بند ہی نہیں ہو رہی تھی۔ تعلیم و تربیت پڑھنے والے تمام ساتھیوں کو نیا سال مبارک تعلیم و تربیت میں وہ تمام خوبیاں ہیں جو ایک اچھے رسالے میں ہوتی ہیں (سارہ نعیم' مقام نہیں لکھا)

دسمبر کا شمارہ پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ کہانیوں میں مانگ کی قربانی' آپی' ہمسائے' اور پانچ سیکنڈ کا آپریشن پسند آئیں۔ نظموں میں قائداعظم' سرما اور قائد کا پیغام پسند آئیں (سید علی عرفان حیدر زیدی اخلاص گڑھ)

اس ماہ سرورق کچھ خاص نہ تھا۔ لیکن قائداعظم کلاسک' پانچ سیکنڈ کا آپریشن' ہمسائے اور فرض ادا کرنا ہو گا پسند آئیں۔ انکل ایہ بتائیں کہ آپ بھی لکھے میں کہانی کتنے عرصے میں شائع ہو جاتی ہے (محمد غیاث اعوان جھنگ صدر)

☆ زیادہ سے زیادہ تین ماہ میں۔ اگر کہانی کے ساتھ جوابی لفافہ ارسال کیا گیا ہو تو اس عرصہ میں تحریر ناقابل اشاعت ہونے کی صورت میں رائٹر کو واپس ارسال کر دی جاتی ہے۔ بصورت دیگر ردی کی ٹوکری کی نذر ہو جاتی ہے۔ اڈیٹر

دسمبر کا شمارہ بہت اچھا تھا۔ کافی عرصے بعد اتنا دل کش سرورق آیا۔ کہانیوں میں پانچ سیکنڈ کا آپریشن' اور آخری حربہ بہت پسند آئیں۔ نظمیں بھی پسند آئیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ 1997ء میں

تعلیم و تربیت پہلے سے بہت زیادہ منفرد ہو گیا ہے اور اب آپ اسے اور زیادہ بہتر بنائیں (عمران علی فیصل آباد)

دسمبر کا پرچہ اپنی مثال آپ تھا۔ کہانیاں بھی اچھی تھیں۔ اب آپ مجرم کون شروع کریں (سلیم جہانگیر خان کراچی)

اس ماہ کا سرورق بالکل متاثر نہ کر سکا لیکن سید نظر زیدی کی کہانی فرض ادا کرنا ہو گا بہت عمدہ رہی۔ باقی کہانیوں میں آپی اور اتوار بازار بہت اچھی تھیں (سعدیہ سردار گوجرہ)

تمام کہانیاں پسند آئیں لیکن مانگ کی قربانی سب سے زیادہ پسند آئی۔ دل چسپ اور ناقابل یقین بھی عمدہ تھے (شاہ رخ طاہر لاہور)

میں پانچ سال سے تعلیم و تربیت پڑھ رہی ہوں۔ دسمبر کا شمارہ ہر طرح سے لاجواب تھا۔ اس کی تعریف کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ یہ صرف محض ڈایلاگ ہی نہیں بلکہ یہ واقعی ایک شان دار رسالہ ہے۔ میں فخر سے کہہ سکتی ہوں کہ میرا پسندیدہ رسالہ ہر لحاظ سے منفرد ہے (سیدہ عظمیٰ ہمدانی قصور)

دسمبر کا ٹائٹل بہت اچھا تھا۔ نظم قائداعظم بہت پسند آئی۔ کہانیوں میں فرض ادا کرنا ہو گا اور ہمسائے بہت پسند آئیں کارٹون کہانی بھی اچھی تھی (ضیغم عباس جلال پور جٹاں)

سرورق بہت عمدہ تھا۔ تمام کہانیاں نمبرون تھیں۔ خاص طور پر مانگ کی قربانی' آپی اور ہمسائے پسند آئیں۔ انکل چٹ پٹے مسالے دار کا سلسلہ بھی شروع کریں (علی احمد چٹھہ سیال کوٹ)

بھیا جی' اس دفعہ کا رسالہ اپنی مثال آپ ہے۔ ہر کہانی ایک سے بڑھ کر ایک ہے۔ خاص طور پر اتوار بازار تو سب پر سبقت لے گئی۔ آیئے مسکرائیں بھی مزے دار رہا۔ محمد عدیل دانش کی شیر دل بھی اچھی تھی (شازی سیماب گوجرانوالہ)

سرورق بہت عمدہ تھا۔ کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ خاص طور پر مانگ کی قربانی' اتوار بازار اور ہمسائے۔ نظمیں بھی بہت زبردست تھیں (عمارہ اکرام لاہور)

تمام کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ خاص طور پر مانگ کی قربانی اور اتوار بازار نے تعلیم و تربیت کی سابقہ روایات کو قائم رکھتے ہوئے دسمبر کے شمارے کو چار چاند لگا دیئے (راؤ عابد علی لاہور)

اس شمارے میں پانچ سیکنڈ کا آپریشن نمبرون تھی۔ اس کے علاوہ مانگ کی قربانی' آپی اور اتوار بازار بھی اچھی تھیں۔ سرورق بھی بہت رنگین اور اچھا تھا (قرۃ العین' تابندہ حسین لالہ موسیٰ)

دسمبر کا شمارہ بہت ہی مزے دار تھا۔ کہانیوں میں فرض ادا کرنا ہو گا بہت پسند آئی۔ اس کے علاوہ پانچ سیکنڈ کا آپریشن بہت پسند آئی۔ ہمسائے کہانی بھی پسند آئی (شہزاد اسفند یار گجرات)

سرورق کچھ خاص نہیں تھا۔ باقی تمام نظمیں' کہانیاں اور مضامین زبردست تھے (محمد امتنان چودھری فیصل آباد)

سرورق بہت اچھا تھا۔ کارٹون کہانی زیادہ خاص نہیں تھی۔ کہانیوں میں آپی' ہمسائے اور اتوار بازار پسند آئیں (آمنہ چوہان اوکاڑہ)

میں چار سال سے تعلیم و تربیت کا قاری ہوں اور اب تک تین بار خط لکھ چکا ہوں مگر ایک بھی شائع نہیں ہوا۔ مجھے دسمبر کے رسالے سے مانگ کی قربانی' فرض ادا کرنا ہو گا اور اتوار بازار بہت بھائیں (ساجد علی تجمل بہاول پور)

دسمبر کا سرورق کافی خوب صورت تھا۔ مانگ کی قربانی' آپی' اتوار بازار اور آخری حربہ بہت اچھی لگیں۔ نظموں میں سرما اور قائداعظم اچھی تھیں۔ لطیفے بھی کافی مزے دار تھے۔ شرارتی لکیریں اچھا سلسلہ ہے (مہرین کاظمی راول پنڈی)

سال کا آخری شمارہ ملا۔ دسمبر کی سرد راتیں اس کی صحبت میں بہت خوب گزریں۔ میں صرف اس وقت خط لکھتا ہوں جب بات کہنا ناگزیر ہو جاتی ہے اور اس دفعہ میں آپ کو اس قدر خوبصورت اور منفرد سرورق شائع کرنے پر داد دینا چاہتا ہوں۔ دسمبر کے شمارے کی تمام تحریریں اچھی لگیں۔ آخر میں آپ کو اور رسالے کو سنوارنے والی تمام ٹیم کو نئے سال کی مبارک باد دیتا ہوں۔ خدا کرے یہ سال آپ کے لیے کامیابیوں اور کامرانیوں کا ہجوم بن کر آئے (شمس القمر عاکف فورملی اٹک)

تعلیم و تربیت ہمارے تمام گھر والوں کا محبوب رسالہ ہے۔ جب سے ہوش سنبھالا تب سے اسے گھر میں پایا۔ کئی بار خط لکھنے کی کوشش کی۔ گزارش ہے کہ مجرم کون کا سلسلہ شروع کریں۔ تعلیم و تربیت کی ہر تحریر اور ہر سلسلہ ایک سے بڑھ کر ایک ہے (علی حسن رانا لاہور)

اس دفعہ کا شمارہ سرورق سے لے کر بلاعنوان تک بہت ہی زبردست رہا۔ خاص کر آپی' پانچ سیکنڈ کا آپریشن' اتوار بازار اور ہمسائے اچھی رہیں لیکن نمبرون کہانی فرض ادا کرنا ہو گا رہی۔ آخری حربہ ایک بہت ہی زبردست تحریر تھی۔ ایک مشورہ ہے کہ کھیلوں کی دنیا میں ہر ماہ کسی نہ کسی کھلاڑی کا انٹرویو دیا کریں (محمد ندیم شہزاد علی پور چٹھہ)

نئے سال پر بیت بازی کا سلسلہ بھی شروع کر دیں۔ نیز انعامی

لطیفہ شروع کریں' واؤدی علمی آزمائش میں خالی جگہ کا سلسلہ بند کر کے اس کی جگہ سوال و جواب کا سلسلہ شروع کریں۔ اور ہاں تعلیم و تربیت انٹرنیٹ پر کب آ رہا ہے؟ (ذیشان سوانگی گدو)

مجھے ایک بات سمجھ میں نہیں آ رہی کہ آپ اتنا اچھا اور معیاری رسالہ کیسے تیار کر لیتے ہیں جو میرے جیسے بندوں کا ایک منٹ میں دل موہ لیتا ہے۔ مانگ کی قربانی اور آپی تو بہت پسند آئیں (عرفان عظیم ہڑاولی ساہی وال سرگودھا)

سرورق بہت خوب صورت تھا۔ تمام کہانیاں بہت اچھی تھیں۔ خاص طور پر فرض ادا کرنا ہو گا اور پانچ سیکنڈ کا آپریشن لاجواب تھیں (اویس خالد ملتان)

دسمبر کا سرورق بہت خوب صورت تھا۔ کہانیاں تمام ہی اچھی تھیں۔ خاص طور پر مانگ کی قربانی' اتوار بازار' پانچ سیکنڈ کا آپریشن' سائنس فکشن آخری حربہ بہت پسند آئیں۔ نظموں میں قائداعظم بہت پسند آئی۔ لطائف بھی اچھے تھے (عامر احمد میاں والی)

دسمبر کا شمارہ بہت شان دار تھا۔ پڑھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ کہانیوں میں مانگ کی قربانی' فرض ادا کرنا ہو گا اور کمانڈو پسند آئیں۔ قائداعظم کلاسک شان دار جا رہا ہے (فرح اکبر سرگودھا)

سرورق بہت عمدہ تھا۔ تمام کہانیاں نمبرون تھیں۔ اب مہربانی کر کے بلاعنوان کا بور سلسلہ بند کر دیں اور اس کی جگہ مجرم کون کا سلسلہ شروع کریں (فیصل مسعود خان پپلاں)

آج کل سرورق کچھ خاص نہیں ہوتے۔ ان میں پہلے والی بات نہیں رہی اور بچہ جھلکڑ نے تو شاید آپ سے بائیکاٹ کر لیا ہے۔ آپ انہیں منانے کی کوشش کریں (اسما جلال پور جٹاں)

دسمبر کا تعلیم و تربیت بہت خوب صورت رنگین اور دلکش لگا۔ اب تو ہمیں جنوری کی خوشخبریوں کا شدت سے انتظار ہے۔ ہونہار مصور کا موضوع اور مصوری اس دفعہ کافی دل چسپ تھی اور آپ کے لطیفے پڑھ کر دل خوش ہو گیا (عمیرہ لطیف فیصل آباد)

سب سے پہلے نئے سال کی مبارک۔ کہانیاں تو سبھی اچھی تھیں لیکن مجھے کمانڈو کہانی سب سے اچھی لگی۔ میری آپ سے گزارش ہے کہ رسالے کو مزید بہتر بنائیں (بشیر احمد گجرات)

دسمبر کا شمارہ اپنی پوری شان و شوکت سے ملا تو دل باغ باغ ہو گیا۔ تمام کہانیاں ایک دوسرے سے اچھی تھیں (سعدیہ قاسم اسلام کوٹ)

دسمبر کا چمکتا دمکتا رسالہ پڑھ کر دل کو بہت سکون آیا۔ اس مہینے کی کہانیاں سب ہی اچھی تھیں۔ نظم سرما بہت اچھی تھی۔ لطیفے بھی بہت اچھے تھے (عبدالستار عابد اواران بلوچستان)

دسمبر کا شمارہ سلسلہ مجاہدین آزادی کے نہ ہونے کی وجہ سے سونا سونا لگا۔ کہانیوں میں مانگ کی قربانی' پانچ سیکنڈ کا آپریشن' آپی' اور کمانڈو بہترین تھیں (محمد سلیم اعوان 'پونہ')

مجھے آپ کا رسالہ بہت پسند ہے اور میں دیکھ رہا ہوں کہ روز بروز کہانیاں' لطیفے اور بلاعنوان پہلے سے اچھے ہو رہے ہیں (محمد اظہر مسعود' اسلام آباد)

بھائی جان ہمارے امتحان شروع ہونے والے ہیں لہٰذا آپ سلسلہ وار ناول جنوری کی بجائے اپریل میں شروع کریں تاکہ ہم اس دل چسپ ناول سے پوری طرح لطف اندوز ہو سکیں (ملک محمد عمران لیہ)

اس ماہ کا سرورق بہت خوب صورت لگا۔ یہ سن کر بہت خوشی ہوئی کہ جنوری 1998ء سے ہمارا تعلیم و تربیت بالکل نیا ہو گا۔ تمام کہانیاں اچھی تھیں۔ لطائف اور نظمیں بھی مزے دار تھیں۔ ''شرارتی لکیریں'' کا سلسلہ بھی اچھا جا رہا ہے (باسط علی بخاری لاہور)

اس دفعہ سرورق بہت ہی پیارا لگا۔ کہانیوں میں مانگ کی قربانی' فرض ادا کرنا ہو گا اور ہمسائے اچھی تھیں۔ نظموں میں سرما مزے دار تھی (اظہر عباس شاہین چنیوٹ)

بھئی حد ہو گئی ہے صبر کی! پہلے ہم نے خط لکھا مگر نہ جانے اس معصوم کی کیا درگت بنی۔ اگر اب اس معصوم نمبر دو کے ساتھ یہ ظلم ہوا تو........ (ہما حسین لاہور)

میں ایک غلطی کی نشان دہی کرنا چاہتا ہوں آخری حربہ میں درج روبوٹ ترانے کے آخری شعر میں امن و آشتی کے بجائے امن و آتشی چھپ گیا ہے (محمد' اسلام آباد)

☆ نشان دہی کا شکریہ (اڈیٹر)

اگر جنوری سے بیت بازی بھی شروع کر دیں تو مہربانی ہو گی۔ قائداعظم کلاسک کے صفحات بڑھا دیں۔ سائنس فکشن کو جاری رکھیں۔ کھیلوں کی دنیا کی جگہ مجرم کون ہونا چاہیے (یاور عباس' امتیاز افضل' پپلاں)

میں تعلیم و تربیت کے لیے ایک مشورہ دینا چاہتا ہوں کہ یہ جیسے اردو میں چھپتا ہے اس طرح اس میں آسان انگلش کے بھی چند صفحات ہونے چاہئیں (فہیم افضل گوٹھ ماچھی صادق آباد)

سرورق بہت اچھا تھا۔ کہانیوں میں ہمسائے' آپی اور اتوار بازار بہت اچھی تھیں۔ نظمیں بھی بہت اچھی تھیں (فاطمہ عزیز لاہور)

آپ بھی لکھیے

خوف کا وہ دن

محمد معروف چشتی، حویلی لکھا

میں نے ضد کر کے آخر گھوڑی لے ہی لی، گھڑ سواری تو ابا جان کو بھی بہت پسند تھی لیکن زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کے پیش نظر موٹر کار اور موٹر سائیکل زیادہ اہم تھے، مگر مجھے گھڑ سواری زیادہ اچھی لگتی تھی۔ چناں چہ میں نے ابا جان کو پرانی خاندانی روایات یاد دلا کر گھوڑی خریدنے پر آمادہ کر لیا۔ گھوڑی تو آ گئی مگر مجھے اکیلے گھڑ سواری کی اجازت نہ ملی۔ ہمیشہ ابا جان کوئی نہ کوئی نوکر ساتھ کر دیتے یا پھر خود ساتھ بیٹھتے۔ گھوڑی خریدے ابھی چند ہی ہوئے تھے کہ ابا جان کو زمین کے مقدمے کے سلسلے میں ساہی وال جانا پڑا۔ کیوں کہ اس وقت ابھی اوکاڑہ ضلع نہیں بنا تھا اور کورٹ کچہری کے لئے ساہی وال جانا پڑتا تھا۔ مجھے اچھا موقع مل گیا اور میں نے گھوڑی پر زین ڈلوالی۔

نوکروں نے مجھے لاکھ روکا مگر میں اس دن اکیلے ہی سواری کا مزا لوٹنا چاہتا تھا۔ میں نے گھوڑی اپنے ننھیالی گاؤں چک پیراں والا کی طرف موڑ لی۔ میرا ارادہ تھا کہ اپنے ماموں زاد بھائیوں سے ملا جائے۔ یہ دوپہر کا وقت تھا اور گرمیوں کا موسم تھا۔ گاؤں زیادہ دور نہ تھا۔ میں جلد ہی وہاں پہنچ گیا۔ سب نے میری اور میری گھوڑی کی خوب تعریفیں کیں اور میں خود کو سلطان ٹیپو سمجھنے لگا۔

میں مختلف طریقوں سے گھوڑی دوڑاتا رہا۔ میرے ایک کزن نے تو موٹر سائیکل پر گھوڑی سے دوڑ بھی لگائی مگر وہ ہار گیا۔ اس کھیل میں میں اتنا مگن رہا کہ شام ہو گئی۔ جب مولوی صاحب نے شام کی اذان دی تو میں نے گھوڑی اپنے گاؤں کی طرف موڑ لی۔ گاؤں سے باہر نکل کر میں نے گھوڑی کو دوڑانا شروع کر دیا۔ مجھے اپنے آپ پر سخت غصہ آ رہا تھا کہ خواہ مخواہ اتنی دیر کر دی۔ ایک طرف اطمینان تھا کہ ابا جان آج ساہی وال سے نہیں آئیں گے تو دوسری طرف دادا جان کا ڈر بھی تھا۔

چک پیراں والا کی حدود ختم ہوئیں تو آگے پٹھانوں کا گاؤں فرید پور شروع ہوا۔ اس سے آگے میرا گاؤں چک انوار تھا۔ شام کا اندھیرا کافی پھیل چکا تھا۔ جب میں فرید پور میں داخل ہوا تو اچانک ایک طرف سے سانپ نکل آیا۔ گھوڑی اس کو دیکھ کر بدک گئی اور سرپٹ دوڑ پڑی۔

گھوڑی میرے قابو سے باہر ہوتی جا رہی تھی۔ آگے سڑک مڑتی تھی مگر گھوڑی میرے قابو میں نہ آئی اور سیدھی مکئی کی فصل میں داخل ہو گئی۔ جون کا مہینا تھا اور مکئی کی فصل اتنی بڑی تھی کہ میں گھوڑی پر بیٹھا نظر نہیں آ رہا تھا۔ گھوڑی کھیت میں پہنچ کر رک گئی۔

میں نے گھوڑی کی گردن پر ہاتھ پھیرا اور پیار سے اس کو تھپ تھپانے لگا۔ پھر اس کو واپس موڑا اور کھیت کے کنارے پر آ گیا۔ مگر یہ دیکھ کر میرے اوسان خطا ہو گئے کہ کھیت کے کنارے کنارے بجلی کے ننگے تار تھے۔ یہ اس لئے لگائے گئے تھے کہ رات کو کوئی فصل نہ خراب کر جائے، یا مکئی کے کھیتوں میں موجود سور جو ایک کھیت سے دوسرے کھیت میں داخل ہو جاتے تھے، تار سے ٹکرا کر مر جائیں۔

میں تو مارے پریشانی کے بے ہوش ہونے لگا۔ پتا نہیں

کھیت میں داخل ہوتے وقت گھوڑی نے کیسے چھلانگ لگائی تھی مگر اب باہر نکلنا مشکل تھا۔ اگر میں گھوڑی سمیت باہر نکلتا تو اس طرح گھوڑی کے پاؤں کا تار سے ٹکرا جانا لازمی تھا۔ اس طرح میری اور گھوڑی کی موت یقینی تھی۔ اگر میں زیادہ دیر کھیت میں گزارتا تو خطرہ تھا کہ کھیت میں موجود سور حملہ کر دیں گے۔ اندھیرا چاروں طرف پھیل چکا تھا۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا۔ جی چاہ رہا تھا کہ رونا شروع کر دوں۔ مگر مجھے دادا جان کی نصیحت یاد آگئی۔ انھوں نے کئی بار مجھے کہا تھا۔

"بیٹا' اگر کبھی سمندر میں بھی گر پڑو تو حوصلہ نہ ہارنا رب کوئی نہ کوئی سبب بنا دیتا ہے"۔

سو میں نے اپنے اوسان بحال کئے اور ترکیب سوچنے لگا۔ اچانک مجھے ایک ترکیب سوجھی۔ ترکیب اتنی زوردار تو نہ تھی مگر اس وقت یہی کچھ ہو سکتا تھا۔ میں گھوڑی سے نیچے اترا اور باگیں اپنے ایک بازو میں ڈال لیں۔ اب میں نے مکئی کے تین پودے اکھاڑے۔ ان میں سے دو بجلی کے تار کے قریب ہی تقریباً ایک دوسرے سے چار فٹ کے فاصلے پر گاڑ دیئے اور تیسرا ان دونوں کے اوپر رکھ دیا۔ پھر میں نے اس پر اپنی سفید پگڑی ڈال دی۔ اب یہ کوئی چار فٹ چوڑی اور تقریباً تین فٹ اونچی سفیدی مائل دیوار بن گئی تھی۔ اس پر سے گھوڑی کو گزرنا تھا۔ اسے پھلانگنے سے گھوڑی انکار بھی کر سکتی تھی مگر اور کوئی راستہ بھی نہ تھا۔

میں بسم اللہ پڑھ کر گھوڑی پر بیٹھا اور گھوڑی کو ذرا پیچھے لے جا کر دوڑا دیا۔ گھوڑی سیانی نکلی۔ اس نے چادر پر سے چھلانگ لگائی اور سڑک پر آگئی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور گھوڑی کو اپنے گاؤں کی جانب سرپٹ دوڑا دیا۔ جلد ہی میں اپنے گاؤں کے پاس پہنچ گیا۔ کسی نے پکارا "معروف" اور میری سانس حلق میں اٹک گئی۔ کیوں کہ یہ آواز میرے چچا جان کی تھی۔ ان کا غصہ پورے علاقے میں مشہور تھا۔ اور ابھی مجھے دادا جان کے سامنے بھی پیش ہونا تھا (پہلا انعام: 100 روپے کی کتابیں)

شوق کی سزا

ارم بتول' واپڈا کالونی چشمہ بیراج

کیا بتائیں آپ کو کہ ہمیں جھیل پر نہانے کا کتنا شوق تھا۔ لیکن افسوس ہمارا یہ معصوم سا شوق ابو جان کو ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ سو ہم دن رات آہیں بھرتے رہتے۔ ان سے طرح طرح کے بہانے کرتے۔ مگر ان کا ایک ہی لفظ "نہیں" ہماری امیدوں پر ڈھیروں پانی پھیر جاتا۔

پھر ایک دن خدا نے ہماری سن ہی لی۔ ہوا یوں کہ امی ابو کو کسی ضروری کام سے لاہور جانا پڑ گیا۔ چوں کہ ہمارے اسکول کے امتحانات قریب تھے۔ اس لئے ہمیں باقی بہن بھائیوں کے ہم راہ گھر میں ہی رہنا تھا۔

بڑے بزرگوں نے خود ہی کہا ہے کہ "گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں" سو ہم ان کے کہے کو کیسے ٹالتے۔ چناں چہ ہم نے وقت کی قدر کرتے ہوئے "فوراً" سے پیشتر ہی تمام دوستوں کو جھیل پر پک نک منانے کی اطلاع کر دی۔ یہ سن کر تو وہ سب حیران ہی رہ گئے۔

مقررہ وقت پر تمام لڑکے اپنی اپنی چیزوں سمیت جھیل پر آن پہنچے۔ کچھ دیر ادھر ادھر گھومنے پھرنے کے بعد نہانے کا پروگرام بنایا۔ ہم تو خود آئے ہی نہانے کے لئے تھے۔ مگر جھیل کا پانی دیکھ کر کچھ خوف زدہ سے ہو گئے اور لگے پسینے چھوٹنے۔ ہماری یہ حالت دیکھ کر تمام لڑکے ہم پر خوب ہنسے اور ہم پر "شرمیلو' شرمیلو" کی آوازیں کسنے لگے۔ یہ سن کر ہم جوش میں آگئے اور خود کو نہانے کے لئے تیار کیا۔ مگر پانی میں پاؤں رکھتے ہی پھر واپس لوٹ آئے۔ یہ دیکھ کر ایک لڑکا ہمارے قریب آیا اور ہمیں تھپکی دیتے ہوئے بولا "مت ڈر میرے بچے"

یہ سننا تھا کہ ہمارے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اور ہم نے پوری قوت سے اس کے چہرے پر تھپڑ دے مارا۔ ہماری اس حرکت پر باقی لڑکوں کو سخت غصہ آیا۔ انہوں نے احتجاجاً ہمیں بازوؤں اور ٹانگوں سے پکڑ کے پانی کی طرف اچھال پھینکا۔

اب ہم تھے اور پانی کی لہریں۔
چوں کہ ہم تیرنے کی "ت" سے بھی ناواقف تھے سو خاک تیرتے۔ اس لئے لگے الٹے سیدھے ہاتھ پاؤں چلانے اور چیخنے چلانے۔ پھر نہ جانے کب کسی نے آکر ہمیں سہارا دیا اور پانی سے باہر نکالا۔ جب ہوش آیا تو اپنے آپ کو گھر میں موجود پایا۔ سب سے پہلے نظر ابو جان پر پڑی۔ ہم نے سر شرمندگی سے جھکا لیا۔ اس پر وہ بولے "میاں صاحب زادے آخر آپ نے اپنا شوق پورا کر ہی لیا۔ مبارک ہو"۔ اور ہمارا سر شرم سے مزید جھک گیا۔ (دوسرا انعام: 90 روپے کی کتابیں)

وہ رشتہ

سامیہ شاذی، راول پنڈی

اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے سلسلے میں میں نے تین سال لندن میں گزارے۔ وہاں پر جتنا عرصہ میں نے گزارا، ایسے قابل ذکر واقعات رونما ہوئے کہ اگر میں بیان کرنے بیٹھوں تو کافی صفحات درکار ہوں گے۔ بہرحال ایک واقعہ جو شاید میرے لئے بہت اہمیت کا حامل تھا وہ کچھ یوں ہے۔
لندن اور وہاں کے تعلیمی اداروں کا ماحول یہاں کے ماحول سے بالکل مختلف ہے۔ مخلوط تعلیمی ادارے ہیں۔ جہاں لڑکے اور لڑکیاں اکٹھے پڑھتے ہیں۔
لندن میں رہائش کے تین سالوں کے دوران میں میں نے ہمیشہ اپنے قومی لباس کو فوقیت دی۔ اور پڑھائی پر اپنی توجہ مرکوز رکھی۔
وہاں پر میری دوستی ایک پاکستانی لڑکی نیلوفر سے ہو گئی۔ نیلوفر پر انگریزی تہذیب کا اس قدر اثر تھا کہ وہ اپنے آپ کو نیلوفر کے بجائے جینی فر کہلوانا پسند کرتی تھی۔ بہرحال نیلوفر کے علاوہ ہمارے گروپ میں بنگلہ دیش کی سلطانہ اور بھارت کی شرلا شامل تھیں۔ کبھی کبھار میرا کزن سعد (جو کہ ہمارے ساتھ ہی پڑھتا تھا) بھی ہمارے ساتھ ہوتا تھا۔ میں، سلطانہ اور شرلا زیادہ تر ساتھ ہی ہوتے تھے۔ میں محسوس کرتی تھی کہ سلطانہ مجھ سے بات کرتے ہوئے جھجکتی تھی۔ میرے ساتھ بات کرتے ہوئے اس کا لہجہ مودب ہوتا تھا۔ شروع شروع میں وہ جینز پہن کر آتی تھی مگر پھر مجھے دیکھتے ہوئے وہ بھی شلوار قمیص پہننے لگی۔ شرلا البتہ پوری کی پوری انگریزی ماحول میں ڈوبی رہتی۔ شرلا سے بات کرتے ہوئے سلطانہ کا لہجہ مجھے بہت سرد مہری والا لگتا تھا۔ گویا وہ مجبوراً اس سے بات چیت کرتی تھی۔
شرلا اور سلطانہ کی نوک جھونک بھی ہوتی رہتی تھی۔ شرلا بہت لائق تھی۔ اس کے علاوہ وہ "سوشل" بھی بہت تھی۔ بہت سے لوگوں سے اس کا میل جول تھا۔ ایک دن ایسی بات ہوئی کہ پھر سلطانہ نے شرلا کی طرف دیکھنا بھی گناہ سمجھ لیا۔ میں نے بھی شرلا سے ناتا توڑ لیا۔ ہوا کچھ یوں کو 16 دسمبر نزدیک تھی۔ کرسمس اور نیوائیر کی چھٹیاں ہونے والی تھیں۔ سردی اپنے عروج پر تھی۔ میں، شرلا اور سلطانہ ساتھ بیٹھے تھے کہ نہ جانے کیسے پاکستان کے قیام کا ذکر چھڑ گیا۔ بس میں تو کچھ جذباتی ہو گئی۔ شرلا بھی اپنے ملک کے حق میں بڑھ چڑھ کر بولی۔ سلطانہ نے بیچ میں بولنے کی کوشش کی تو شرلا نے سخت الفاظ میں اس سے بات کی اور پھر اس نے مجھے اور سلطانہ کو مشترکہ طور پر "بنگلہ دیش" کا طعنہ دیا۔
"ہونہہ، جو قوم اپنے ملک کی حفاظت ہی نہ کر سکے، اس......"
"شٹ اپ!" سلطانہ کی سانولی رنگت دہک رہی تھی۔ اس نے شرلا کو جملہ بھی مکمل نہ کرنے دیا۔ اپنا لہجہ اور آواز بدستور نیچی رکھتے ہوئے سلطانہ الفاظ چبا چبا کر بولی "تم کیا سمجھتی ہو کہ مسلمان الگ ہو جائے تو اس کا دل بھی کٹھور ہو جاتا ہے۔ مائینڈ یو شرلا، ہم ہندو قوم نہیں ہیں کہ اپنے ہی مذہب کے لوگوں کو برابر کا درجہ نہ دیں، یہ ٹھیک ہے کہ پاکستان اور بنگلہ دیش الگ الگ ملک ہیں مگر یاد رکھو کہ ہمارے درمیان ایک ایسا اٹوٹ رشتہ ہے جو کسی سازش سے نہیں ٹوٹ سکتا اور وہ رشتہ ہے "مذہب" کا۔

ہنستا کھیلتا ایسے گھر واپس آگیا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

اب ہاشم کے لیے بھی شاید مصیبتوں کا دروازہ کھل گیا تھا۔ کچھ ہی عرصہ گزرا ہاشم کے والد کا انتقال ہو گیا۔ چوں کہ ہاشم اب بڑا ہو چکا تھا لہٰذا اسے پڑھائی چھوڑ کر اپنے والد کا کپڑے کا کاروبار سنبھالنا پڑا۔ سردیوں کے دن تھے۔ ایک دن ہاشم دکان میں ہیٹر جلا کر کسی کام سے باہر چلا گیا۔ نہیں معلوم کس طرح کپڑوں کے کچھ تھانوں کو آگ لگ گئی۔

ہاشم کو فوراً اطلاع دی گئی۔ ہاشم اور اس کے ساتھیوں نے آگ بجھانے کی بہت کوشش کی مگر کچھ بن نہ پڑا اور آگ نے ساری دکان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ساری دکان سامان سمیت جل کر کوئلے کا ڈھیر بن گئی اور ہاشم ہاتھ ملتا رہ گیا۔ اب ہاشم کا ماتھا ٹھنکا اور اسے یاد آیا کہ کبھی اس نے بھی کم زور اور بے زبان کوؤں کے گھونسلے کو آگ لگا دی تھی۔ شاید یہ اسی کا بدلہ تھا جو ہاشم کو مل چکا تھا (چوتھا انعام: 70 روپے کی کتابیں)

امتحان

ممتاز بشیر، کاہنہ نو

یہ دو سال پہلے کی بات ہے جب میرے سالانہ امتحان شروع ہوئے۔ ان امتحانوں نے میری زندگی عذاب میں ڈال رکھی تھی۔ جیسے جیسے امتحان نزدیک آتے جاتے میرے دل کی دھڑکن تیز ہوتی جاتی تھی۔ نہ جانے اب کیا ہو گا؟ کیوں کہ ایک تو رمضان کا مہینا آرہا تھا اور دوسرے امتحان۔ یہ سوچ سوچ کر میں تو پاگل ہو رہی تھی کہ اب کیا ہو گا؟ آخر خدا خدا کر کے امتحانات ہوئے۔

میں نے ان امتحانوں میں کوئی بھی روزہ نہیں رکھا۔ جب میں اسکول میں پیپر دینے آتی تو میں لڑکیوں سے پوچھتی کہ تمہاری کیسی تیاری ہے۔ وہ بتاتیں کہ بہت اچھی ہے۔ اور ساتھ انھوں نے روزے بھی رکھے ہوتے تھے۔ میں اس پر بڑا خوش ہوتی۔ کیوں کہ میرے ذہن میں یہ بات تھی کہ اگر انھوں نے روزے رکھے ہوئے ہیں تو ان کی تیاری اچھی طرح سے نہیں ہوئی ہو گی۔

خدا خدا کر کے امتحان ختم ہوئے۔ میں نے سوچا شکر ہے بلا سر سے ٹل گئی۔ مگر کہاں؟ ایک اور نئی مصیبت کھڑی ہو گئی اور وہ مصیبت تھی رزلٹ کا انتظار۔ رزلٹ کے بارے میں میں یہ سوچ سوچ کر ہلکان ہو رہی تھی کہ نہ جانے اب کیا ہو گا؟

انتظار کی اس کیفیت نے مجھے دبلا کر دیا تھا۔ لیکن وہ گھڑی، وہ لمحہ میں کبھی نہیں بھول سکتی جب رزلٹ والے دن میں نے اپنے فیل ہونے کی خبر سنی۔ میں تو یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ایسا ہو گا۔ میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ لیکن باقی سب لڑکیوں کے چہروں پر بڑی خوشی تھی۔ وہ سب کی سب پاس تھیں۔ جب نئی کلاسیں شروع ہوئیں تو مجھے پھر دوبارہ اسی کلاس میں جانا پڑا۔ نئی کتابیں پڑھنے کے بجائے وہی کتابیں دوبارہ پڑھنے کو ملیں۔ میرا تو اسکول جانے کو اب دل ہی نہیں کر رہا تھا۔

جب میں کلاس میں داخل ہوئی تو سب لڑکیاں میرے لیے نئی تھیں۔ لیکن میں اکیلی ایک طرف بیٹھی رو رو کے ہلکان ہو رہی تھی۔ اچانک ہماری کلاس میں ایک مس داخل ہوئیں۔

یہ مس شمس النسا تھیں جو پچھلی کلاس میں ہمیں اسلامیات پڑھاتی تھیں۔ انھوں نے کلاس میں آکر سب سے پہلے تمام لڑکیوں سے سلام لیا اور پھر ہمیں پاس ہونے کی مبارک باد دی۔ پھر ہمیں بتایا کہ اب وہ ہماری کلاس کی انچارج ہیں۔ جب مس نے مجھے روتے ہوئے دیکھا تو پہلے تو مجھے تسلی دی کہ کوئی بات نہیں ناکامی کام یابی کی سیڑھی ہوتی ہے۔ تم آئندہ محنت کرنا، ان شاء اللہ کام یاب ہو جاؤ گی۔ پھر انھوں نے مجھے کہا کہ تم دنیا کے امتحان کے بارے میں تو اتنی پریشان ہو کبھی یہ بھی سوچا کہ آخرت کے امتحان میں تمہارا کیا ہو گا؟ دنیا کے امتحان میں تو انسان دوبارہ محنت کر کے کام یاب ہو سکتا ہے لیکن آخرت کے امتحان کا موقع تو صرف ایک دفعہ ہی ملتا

ہے۔ زندگی کی ڈور کا کوئی پتا نہیں کس سے کٹ جائے اور ہم دنیا سے نیک اعمال کی حسرت لیے اس جہان فانی سے کوچ کر جائیں۔ پھر وہاں کا عذاب اور تکالیف کون سہے گا؟ وہاں دنیا کی طرح سپلی نہیں ہوا کرے گی۔ اور نہ ہی وہاں ایک بار فیل ہونے کے بعد دوسری بار امتحان دینے کا موقع ملتا ہے۔ اس لیے اس سے پہلے کہ وقت بہتے پانی کے دھارے کی طرح ہمارے ہاتھ سے نکل جائے ہمیں وقت کی ڈور کو تھام لینا چاہیے۔ تاکہ وہاں کے امتحان میں کامیاب ہو کر اپنے رب کے انعامات کے مستحق ٹھہر سکیں۔

وہ بچے کتنے خوش قسمت ہیں جنھوں نے رمضان کے روزے بھی رکھے اور امتحانوں کی تیاری بھی کی۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کی رحمت کے ساتھ ساتھ انھوں نے امتحانوں میں بھی کامیابی حاصل کر لی۔

اس وقت مجھے اپنے آپ پر بڑا غصہ آرہا تھا۔ کیوں کہ اس مبارک مہینے میں میں اللہ کی رحمت سے بھی دور رہی اور امتحانوں میں بھی ناکام ہوئی۔ اب مجھ پر مس کی باتوں کا بڑا گہرا اثر ہوا اور میں نے آئندہ سخت محنت کرنے اور پانچوں وقت کی نمازیں پڑھنے کا پکا ارادہ کر لیا۔ پھر میں نے اپنی مس شمس کا شکریہ ادا کیا۔

اب میں ایک نالائق لڑکی کے بجائے ایک لائق لڑکی بن گئی ہوں۔ ہر جگہ میری عزت ہوتی ہے۔ لڑکیاں مجھ سے دوستی کا ہاتھ بڑھاتی ہیں اور جب مس کو کوئی کام ہوتا ہے تو وہ بھی مجھ سے کہتی ہیں۔ اور میں وہ کام بڑے شوق سے کرتی ہوں۔ اس طرح اب مجھے قوی امید ہے کہ میں نہ صرف دنیا بلکہ آخرت کے امتحان میں بھی ان شاء اللہ کام یاب ہو جاؤں گی۔ (پانچواں انعام: 60 روپے کی کتابیں)

انکل کرمو

مہ وش امین، لیاقت پور

آئیے ہم آپ کی ملاقات انکل کرمو سے کرواتے ہیں ہو کہ بڑے کرم والے ہیں۔ ہر چیز میں سے کرم نکالنا ان کا بائیں ہاتھ کا کام ہے۔

آپ انیس سو کچھ میں صوبہ سندھ کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ پیدائش کے کچھ عرصہ بعد آپ نے بڑا ہونے کی ٹھانی۔ جب آپ کچھ ٹھان لیتے ہیں تو کر کے ہی دم لیتے ہیں۔

چناں چہ آپ پہلے لمبائی میں بڑے ہوئے اور پھر موٹائی میں۔ اس کے بعد آپ عمر میں بڑا ہونا شروع ہوئے۔ چناں چہ اب آپ کی عمر آپ سے خاصی بڑی ہے۔

بچپن میں سپورٹس مین بھی رہے۔ چناں چہ اسکول سے بھاگنے میں خاصا نام کمایا۔ ویسے بھی آپ نے اب تک جو کمایا وہ لے دے کے ایک نام ہی تو ہے۔

ساتویں جماعت سے شاعری کا بے قاعدہ آغاز کیا۔ باقی کام غالباً پہلے شروع کر دیے تھے۔ البتہ شاعری کا باقاعدہ آغاز آپ نے شیر خواری کے دور میں رونے سے کیا تھا۔ چناں چہ اس دور میں بھی ترنم سے شعر پڑھتے تھے۔ موسیقی کی سب نئی دھنیں آپ نے اسی دور میں ایجاد کیں۔ جوانی میں آپ کے ترنم کی بڑی دھوم تھی۔ جس مشاعرے میں شعر پڑھتے اس میں دور دور تک دھوم مچ جاتی اور مشاعرہ ختم کر دیا جاتا تھا۔ لوگ آپ کی مزاحیہ شاعری پر رو پڑتے اور سنجیدہ شاعری پر ہنس پڑتے تھے۔

آپ نے کئی مشہور تعلیمی اداروں میں تعلیم پائی۔ بعض ادارے آپ ہی کی وجہ سے مشہور ہوئے۔ آپ نے اپنی عمر کا کافی عرصہ گم شدہ چیزیں تلاش کرنے میں گزارا۔ بالآخر آپ بوڑھا ہونے شروع ہوئے حال آں کہ اب تو لوگ مایوس ہو گئے تھے کہ آخری وقت میں کیا خاک بوڑھے ہوں گے۔

آپ بیمار ہوئے۔ مگر بیماری میں بھی آپ چین سے نہ بیٹھے۔ یہاں تک کہ ایک دن اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ اور ایک مدت سے وہیں گھر بنائے بیٹھے ہیں۔ واپس آنے کا نام ہی نہیں لیتے (چھٹا انعام: 50 روپے کی کتابیں)

☆ ☆ ☆

انوکھا احسان

ڈاکٹر رضوان ثاقب

یہ اپریل کی 17 تاریخ تھی۔ میری بہن کی شادی یکم مئی کو ہونا قرار پائی تھی۔ میرے والد صاحب اسی سال فروری کی 22 تاریخ کو قضائے الٰہی سے وفات پا گئے تھے' اس لیے شادی کے تمام انتظامات کی ذمہ داری مجھ پر آن پڑی تھی۔ میں گھر سے چیک بک لے کر نکلا اور بنک سے ستر ہزار روپے کا چیک کیش کروا کر لاہور کی جانب چل پڑا۔ میں دراصل ان پیسوں سے شادی کے سلسلے میں جو سامان باقی رہ گیا تھا' وہ خریدنا چاہتا تھا۔ میں ابھی جویانوالہ موڑ سے تھوڑا آگے گیا تھا کہ ایک شخص نے لفٹ لینے کے لیے میری گاڑی کو ہاتھ دیا۔ مجھے وہ شخص اجڑی ہوئی حالت اور پھٹے پرانے کپڑوں کی وجہ سے کوئی مزدور لگ رہا تھا۔ میں نے اس پر ترس کھاتے ہوئے کار روک کر اسے بٹھالیا۔

میں اسے بٹھانے کے بعد گاڑی لاہور کی جانب دوڑائے جا رہا تھا۔ میری جیب میں چوں کہ خاصی رقم تھی' اس لیے میں نے احتیاط کے طور پر جیب کو ٹٹولا۔ پھر یہ دیکھنے کے لیے کہ میری اس حرکت کا پیچھے بیٹھے ہوئے آدمی پر تو کوئی اثر نہیں ہوا' میں نے شیشے میں سے پیچھے دیکھا۔ یہ سب کچھ مجھ سے شاید غیر ارادی طور پر ہو رہا تھا۔ مگر میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ پیچھے بیٹھے ہوئے شخص کا لباس قیدیوں والا تھا اور اس کے ہاتھ پر ہتھ کڑی لگی تھی۔ میں نے اپنے آپ کو قدرے سنبھالا اور اس سے پوچھا "جناب! آپ کہاں جائیں گے؟"
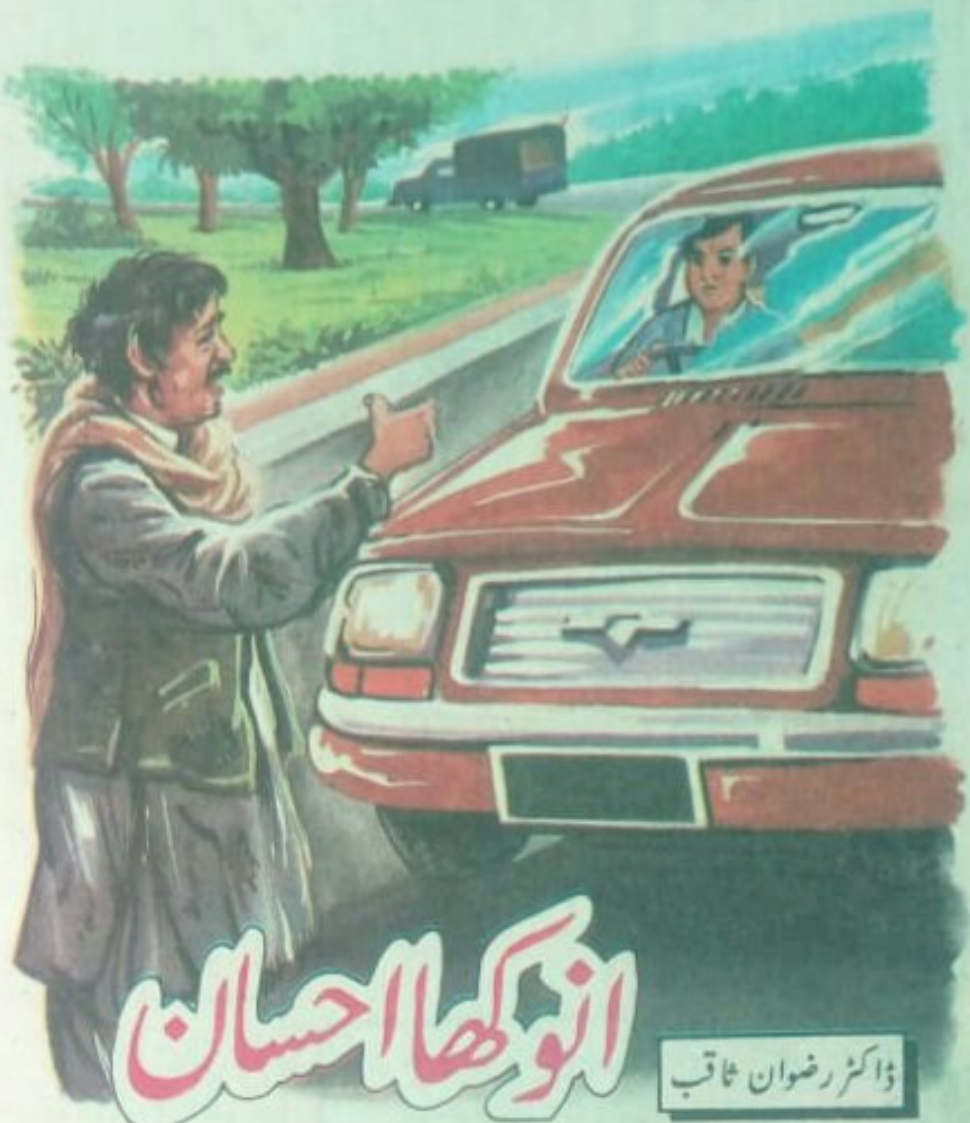
"یہیں کہیں راستے میں اتر جاؤں گا" اس نے مختصر سا جواب دیا۔

"کیا آپ اپنا تعارف کروانا پسند کریں گے؟" میں نے ہمت کر کے پوچھا۔

"جی ہاں...... کیوں نہیں ...... میں محنت مزدوری کر کے روزی کمانے والا ایک مزدور ہوں۔ ایک فن سیکھا تھا اور سال ہا سال سے اس فن کے ذریعے روزی کماتا چلا آرہا تھا۔ مجھے کبھی بھی سزا نہیں ہوئی تھی۔ کبھی پکڑا جاتا تو راہ گیروں اور مسافروں سے مار کھا کر چھوٹ جاتا۔ اگر تھانے تک جانے کی نوبت آجاتی تو کچھ دے دلا کر چھوٹ جاتا تھا۔ مگر جب سے تھانے میں تھانے دار زبیر خاں آیا' دے دلا کر

چھوٹنے کے سب راستے بند ہو گئے ہیں...... بس جو پھنس جاتا ہے فوراً چالان کر کے اسے جیل بھیج دیا جاتا ہے۔ میں بھی اسی زبیر خاں کا ڈسا ہوا ہوں۔ اگر وہ اس تھانے میں نہ ہوتا تو مجھے کوئی جیل نہ بھیجتا۔

آج میری جج کے ہاں پیشی تھی۔ مجھے جیل سے کچہری لایا جا رہا تھا۔ راستے میں رفع حاجت کے بہانے میں نے گاڑی رکوائی۔ میرے ساتھ ایک مسلح فرد بھی نیچے آیا۔ اس نے میری ہتھ کڑی کو مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا لیکن ہم گاڑی سے ابھی تھوڑی دور گئے تھے کہ میں نے اس کے بندوق والے ہاتھ پر کک لگائی۔ بندوق دور جا گری۔ ہتھ کڑی کی کڑیاں تو میں پہلے ہی کم زور کر چکا تھا' لہٰذا میرے ایک جھٹکے سے ٹوٹ گئی۔ اور یوں میں فرار ہونے میں کام یاب ہو گیا۔ بندوق کی گولیوں نے میرا تعاقب کیا' لیکن مجھے معلوم تھا کہ پولیس اہل کار کی گولی مجھے نہیں لگے گی' کیوں کہ مجھ پر فائرنگ کرنے والے کو یہ علم تھا کہ میں ان کا مستقل گاہک ہوں اور ان کا حصہ انہیں باقاعدگی سے پہنچاتا رہتا ہوں۔ اگر وہ مجھے آج زخمی یا ہلاک کر دیتا تو اس کی آمدن کا ایک بڑا دروازہ مستقل طور پر بند ہو جانا تھا"۔

"مگر آپ کرتے کیا ہیں؟" میں نے اس کی بات سن کر جھنجھلا کر پوچھا۔

"جناب! میں ایک جیب کترا ہوں"۔

"ہائیں جیب کترا؟" میرے منہ سے ہوک سی نکل گئی اور میرا ایک ہاتھ فوراً اپنی پیسوں والی جیب پر چلا گیا۔

سنسان سڑک پر میں جیب کترے اور ایک مفرور قیدی کے ساتھ تنہا سفر کر رہا تھا۔ مجھے اپنے پیسوں کی بھی فکر تھی اور مفرور کی مدد کرنے کے جرم کا بھی احساس تھا۔ میں چاہتا تھا جلد از جلد اسے قانون کے حوالے کر کے محب وطن ہونے کا ثبوت دوں۔ اب میری گاڑی بہت تیز رفتاری سے چل رہی تھی۔ میں اشاروں کو کاٹتا اور ٹریفک قوانین کی خلاف ورزی کرتا ہوا گاڑی کو لاہور کی طرف دوڑائے چلا جا رہا تھا۔

میرے پیچھے پیچھے گشتی پولیس کی ایک گاڑی آ رہی تھی۔ میری ان حرکتوں کو دیکھتے ہوئے اس نے میرا تعاقب کرنا شروع کر دیا تھا' مگر مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ میرا تعاقب کر رہی ہے۔ مجھے اس وقت معلوم ہوا جب جیب کترے نے پستول کی نال میری کمر کو لگاتے ہوئے کہا "دیکھو مسٹر' پولیس کی گاڑی ہمارے سر پر پہنچ چکی ہے۔ ممکن ہے وہ تمہیں روک کر کچھ پوچھ گچھ کریں۔ اگر تم نے مجھے گرفتار کروانے کی کوشش کی تو یاد رکھو کہ میرا تو جو انجام ہو گا سو ہو گا' مگر تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا"۔

پولیس کی گاڑی ہمیں اوور ٹیک کر کے آگے پہنچ چکی تھی اور اب اسی گاڑی کی طرف سے مجھے رکنے کا اشارہ دیا جا رہا تھا۔ میں اس ادھیڑ بن میں تھا کہ بہن کی شادی بھی بہت قریب ہے۔ پہلے ہی والد صاحب کی وفات کی وجہ سے شادی کی طے شدہ تاریخ کو ملتوی کرنا پڑا تھا۔ اب میری موت کے بعد نہ جانے یہ فریضہ کب ادا ہو پائے۔ لیکن اگر اس کو پولیس کے حوالے نہیں کرتا تو یہ ایک بہت بڑا جرم ہے۔ جب مجھے علم ہو گیا ہے کہ مجرم ہے اور فرار ہوا ہے تو پھر ملک و قوم سے محبت اور دین کے فہم کا یہی تقاضا ہے کہ جان جائے تو جائے مگر مجرم نہ جانے پائے۔

رکنے کا اشارہ پاتے ہی میں نے بریک پر آہستہ آہستہ دباؤ بڑھانا شروع کر دیا تھا اور اب میری کار مکمل طور پر رک چکی تھی۔ پولیس کی گاڑی میری کار سے چند قدم کے فاصلے پر رکی۔ اس میں سے پولیس کا ایک سپاہی نکلا اور میری کار کی طرف آیا۔ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ پولیس والے کی جانب سے تلاشی لینے سے پہلے ہی بتا دوں کہ میری گاڑی میں ایک مجرم چھپا ہوا ہے' لیکن اس نے تو اس بات کا موقع ہی نہ دیا۔

وہ کہنے لگا "جلدی سے کاغذات دکھاؤ"۔

میں نے گاڑی کی رجسٹریشن بک نکال کر اسے دی۔

وہ کہنے لگا "آپ کا ڈرائیونگ لائسنس کدھر ہے"۔

میں نے کہا "وہ تو میرے پاس نہیں"۔

"تمہارے پاس لائسنس نہیں اور ٹریفک کے قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے بھی پائے گئے ہو۔ بتاؤ چھوٹنے کا پروگرام ہے یا آپ کا چالان کر دوں اور کاغذات لے لوں؟"

میں اس کا مطلب صاف سمجھ رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ میں اسے کچھ رقم بطور رشوت دے دوں' مگر مجھے تو یہ علم تھا کہ رشوت لینے اور دینے والا دونوں جہنمی ہوتے ہیں۔ میں نے فوراً کہا "جناب! آپ چالان کر دیجیے"۔

اس نے میرا چالان کر دیا اور میری گاڑی کے کاغذات علاقہ مجسٹریٹ کے دفتر میں پہنچانے کے لیے جیب میں ڈال لیے۔ میں نے اس کو بھی غنیمت جانا اور اسٹیرنگ کو سنبھالتے ہوئے کار چلانے لگا۔ اور مسلسل چلاتا رہا۔

لاہور سے تھوڑا پہلے ایک سٹاپ آتا ہے جسے جیاموسیٰ کہتے ہیں۔ اس شخص نے اس سٹاپ پر پہنچ کر کہا "جناب' مجھے یہاں ڈراپ کر دیجیے"۔

میں نے گاڑی غیر ارادی طور پر روک دی۔ وہ نیچے اترا اور میری طرف ایک کاپی بڑھاتے ہوئے کہنے لگا "لیجیے جناب' آپ کا بہت شکریہ کہ آپ نے مجھے مسافر جانتے ہوئے میری مدد کی۔ یقیناً آپ بہت اچھے آدمی ہیں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کاغذات چھڑوانے میں آپ کا پورا دن ضائع ہو' اس لیے میں تو گناہ گار تھا ہی' جہاں پہلے اتنی جیبیں کاٹی تھیں وہاں آپ کی گاڑی کے کاغذات نکالنے سے میرے جرائم کی سیاہی میں کوئی خاص فرق نہیں پڑتا تھا۔ جب وہ سپاہی چالان چٹ لکھ رہا تھا' میں نے اس کی جیب سے آپ کی گاڑی کے کاغذات نکال لیے تھے"۔

میں بہت حیران ہوا کہ اس کے دل میں عادی مجرم ہونے کے باوجود بھی احسان کا بدلہ احسان میں دینے کا جذبہ کس قدر موجود ہے۔

میں نے کہا "بھائی! آپ کو میرے ایک چھوٹے سے احسان پر میری تکلیف کا کتنا احساس ہوا ہے اور آپ نے چاہا کہ مجھے ذرا سی پریشانی بھی نہ ہو' لیکن دیکھیے جس ہستی نے آپ پر لاتعداد احسان کیے ہیں' آپ کو اس کی مخلوق اور اس کے کنبے کو ستاتے ہوئے کبھی یہ احساس نہیں ہوا کہ آپ کتنے احسان فراموش ہیں' کیا آپ واقعی احسان فراموش نہیں؟"

"نہیں ...... میں کبھی احسان فراموش نہیں بننا چاہتا ...." اس نے کہا۔

"تو بس پھر اگر آپ احسان فراموش نہیں بننا چاہتے تو آج ہی سے سچے دل سے توبہ کریں اور یہ عہد کریں کہ اپنے ہاتھ اور زبان سے کبھی کوئی ایسا فعل سرزد نہیں ہونے دیں گے جس سے آپ کے عظیم محسن یعنی اللہ تعالیٰ کے کنبے "مخلوق خدا" کو نقصان پہنچے۔

"میں عہد کرتا ہوں ...... اچھا خدا حافظ ...... میں چلتا ہوں"۔

"بھئی کہاں جا رہے ہو؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"آج میری عدالت میں پیشی تھی۔ ابھی عدالت کا وقت باقی ہے۔ میں اپنے آپ کو عدالت میں پیش کر کے اپنے جرائم کی سزا پانا چاہتا ہوں تاکہ میں نے اپنے محسن کے جن احسانات کو فراموش کیا ہے' اس کا کچھ کفارہ ادا ہو سکے"۔

"یا اللہ اسے ماحول کی تمام آلائشوں سے بچانا اور اس کے ساتھ اپنی خصوصی محبت اور رحمت کا سلوک کرنا اور اسے اس آزمائش میں سرخروئی نصیب فرمانا"۔ جیاموئی کے لب پر آسمان کی طرف منہ اٹھا کے میں نے اس عادی مجرم کے حق میں دعا کی۔ کسی مجرم کے لیے میرے دل میں پہلی دفعہ اتنی زیادہ ہمدردی پیدا ہوئی تھی۔

جس شخص کو میں تھوڑی دیر پہلے قانون کے حوالے کرنا چاہتا تھا' اب اسے قانون سے نجات دلانے کے لیے میرے منہ سے دعائیں نکل رہی تھیں۔ پھر میں نے گاڑی کو آگے بڑھا دیا۔ یہ واقعی اس شخص پر اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان تھا کہ اسے ہدایت کا راستہ مل گیا تھا۔ یہ شاید اس کا بدلہ تھا کہ اس نے مجھ پر احسان کیا تھا۔ مجھے احساس ہو رہا تھا کہ اللہ تعالیٰ کبھی اپنے عہد کو نہیں بھولتے۔ اللہ نے فرمایا ہے:

"میں احسان کرتا ہوں احسان کرنے والوں پر"۔

بہرحال ایک عادی مجرم کا احسان اور خالق کائنات کا احسان اپنے اپنے وقار' مرتبے اور حیثیت کے مطابق ہی ہونا تھا' سو ایسا ہی ہوا۔ اسے ایک عظیم احسان سے نوازا جا چکا تھا یعنی اسے ہدایت کا راستہ مل گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی احسان کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)